www.urducouncil.nic.in

مارچ 2020 ، قیمت :- ₹10

ماہنامہ

بچوں کی دنیا

نئی دہلی

Monthly BACHON KI DUNIYA, New Delhi

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ اردو دنیا دہلی

Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

تمام تر رنگین صفحات اور دیدہ زیب تصاویر سے مزین ماہانہ عالمی جریدہ جسے آپ پوری دنیا میں اردو زبان کے کسی بھی ماہنامے سے بہتر پائیں گے۔ اردو کو آج کی دنیا سے جوڑنے والا اور عام اردو قاری و ادبی حلقوں کی دلچسپی کے ساتھ طلبا و اساتذہ کی ضرورتوں کا بھی خیال رکھنے والا اردو کا ماہنامہ

ہر شمارے میں پڑھیے، اردو کے ادبی شاہکاروں کے علاوہ، علمی مضامین، ادبی انٹرویو، تاریخ، سائنس، صحافت، نئی کتابوں پر تبصرے، قومی اردو کونسل کی سرگرمیوں، سمیناروں اور فروغ اردو سے متعلق نئی کاوشوں کا احوال اور بہت کچھ!

فی شمارہ: 15 روپے، سالانہ: 150 روپے

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

سہ ماہی فکر و تحقیق

قومی اردو کونسل کی منفرد پیش کش

اردو زبان و ادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظر عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

آج ہی اپنے نزدیکی بک اسٹال سے طلب کیجیے یا ہمیں لکھیے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی 110066، فون: 26109746، فیکس: 26108159

E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

بچوں کی دنیا

جلد:8 شمارہ:03 مارچ 2020

مدیر : ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

نائب مدیر :ڈاکٹر عبدالحی

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان

وزارتِ ترقی انسانی وسائل۔ محکمہ اعلیٰ تعلیم، حکومتِ ہند

فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا،

جسولہ، نئی دہلی -110025

فون:49539000

شعبہ ادارت:11-49539009

ای میل

bachonkiduniya@ncpul.in

editor@ncpul.in

ویب سائٹ

http://www.urducouncil.nic.in

قیمت: /10 روپے، سالانہ/100 روپے

▪ اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں

Total Pages: 64

'بچوں کی دنیا' کی خریداری کے لیے چیک، ڈرافٹ یا منی آرڈر بنام NCPUL، شعبہ فروخت کے پتہ پر بھیجیں اور وضاحت طلب امور کے لیے وہیں رابطہ فرمائیں۔

شعبہ فروخت

ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم

نئی دہلی - 110066

فون:26109746

ای میل:sales@ncpul.in

ncpulsaleunit@gmail.com

علاقائی مرکز: 110-7-22 تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس

بلاک نمبر 5-1، پتھرگٹی، حیدرآباد -500002

فون:040-24415194

اس شمارے میں

مدیر کا خط	آپس کی باتیں		04
بڑوں کی باتیں	ڈاک خانہ		05
مضامین	اکبر الہ آبادی	صغریٰ مہدی	06
	داراشکوہ کی پیاری بہن جہاں آرا	خواجہ عبدالمنتقم	10
	اواومکن ٹائر	ڈیل کارنیگی	12
	رامانجن	انتخاب بن تنویر	15
نظمیں	ہولی نئی بہار کا پیغام لائی ہے	مظفر حنفی	17
	غریب اور امیر بچے	رام داس	18
	کیسی خالق ہو...	شارق عدیل	19
	محنت کا پھل	اشفاق کارنجوی	20
	اک چوہے کی فریاد	امان الحق بالاپوری	21
	علم اب انگلیوں کی زینت ہے	رؤف خیر	21
کہانیاں	پیار کی جیت	محمد اطہر مسعود خان	22
	تعلیم کا مقصد	شفیق الرحمن صدیقی	26
	ایک دیا روشنی کا	غلام محی الدین ترک	28
	تین لفافے	فیروز عابد	33
	زخمِ دل	پرویز احمد	35
	پانڈا	حشمت کمال پاشا	38
نظمیں	تتلی رانی	رحیم رضا	42
	چائے روٹی	شمیم اختر	42
اردو کا جادو	اردو زبان کا جادو	ادارہ	43
باتصویر کہانی	انسانیت	انیس اعظمی	44
قسط وار ناول	آدتیہ سمندری لڑکا	انیتا سرن	48
کہکشاں	آخری قربانی	ابراہیم اختر	56
	دانائی کی باتیں		57
	اقوالِ زرّیں	ارم لیاقت پٹھان	58
	دل	سید ارشاد عالم	58
ننھے فنکار	چار سال کا بوڑھا	جبیرہ جیلانی مکاندار	60
	بچوں کی پینٹنگ		61

آپس کی باتیں

دوستو! مارچ کا شمارہ حاضر ہے۔ اس ماہ کی 8 تاریخ کو پوری دنیا میں خواتین کی تعلیم وتربیت اور مختلف شعبہ ہائے زندگی میں ان کے تئیں بیداری کے پیدا کرنے کے لیے عالمی یوم خواتین منایا جاتا ہے۔ یوم خواتین پہلی دفعہ 28 فروری 1909 کو امریکہ میں منایا گیا تھا۔ بعد میں لوگ فروری کے آخری اتوار کو یومِ عالمی خواتین منانے لگے۔ پہلے جولین کلینڈر کے مطابق آخری اتوار 23 تاریخ کو آتا تھا لیکن جب بہت سارے ملکوں نے جولین کلینڈر کی بجائے گریگرین کلینڈر کو اپنا لیا تو اس حساب سے یہ دن 8 مارچ کو آنے لگا اور تبھی سے 8 مارچ کو لوگ پوری دنیا میں یومِ خواتین مناتے ہیں۔ یہ دن بہت اہمیت کا حامل ہے کہ خواتین کا ہماری زندگی میں بہت اہم مقام ہے۔ یہ خواتین ہی ہیں جن کی وجہ سے پوری کائنات میں رنگ ہے اور انھیں ہی پہلی درسگاہ کی حیثیت بھی حاصل ہے مگر انھیں مدتوں تک وہ مقام نہیں دیا گیا جس کی وجہ سے عالمی یومِ خواتین کی ضرورت محسوس کی گئی۔

قدیم تاریخ کے مطالعے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ زمانہ قدیم میں روم، یونان، یوروپ اور دیگر ممالک میں عورتوں کو وہ مقام ومرتبہ حاصل نہیں تھا جو آج انھیں حاصل ہے اور نہ ہی انھیں وہ حقوق اور آزادی حاصل تھی۔ عورتیں گھر کی چہار دیواری میں قید تھیں اور ان سے گھریلو کام ہی لیے جاتے تھے لیکن دھیرے دھیرے حالات میں تبدیلی آئی اور سماج میں عورتوں کی تعلیم وتربیت کا سلسلہ شروع ہوا تو خواتین کی حالت میں بھی تبدیلی آئی اور انھیں بھی معاشرے کا ایک اہم حصہ سمجھا گیا اور آج انہی تبدیلیوں کا اثر ہے کہ خواتین ہر میدان میں کامیابی کے پرچم بلند کر رہی ہیں۔

یہ بات آپ سبھی کو معلوم ہے کہ اسلام سے پہلے لڑکیوں کو قبر میں زندہ دفن کر دیا جاتا تھا لیکن اسلام نے عورتوں کا مقام بلند کیا، ان کو برابری کے حقوق دیے۔ اسلام میں ماں کے قدموں کے نیچے جنت کی بشارت دی گئی۔ اسی طرح ہندو مذہب میں عورت کو دیوی کا روپ مانا گیا اور اسے لکشمی بھی کہا گیا۔ ان ساری باتوں کا مقصد بس اتنا واضح کرنا ہے کہ آپ سب ماں بہن، خالہ، پھوپھی، چچی جیسے رشتوں کی اہمیت کو سمجھیں اور سب کی عزت کریں۔ آپ جب چھوٹے رہے ہوں گے تو آپ کو اندازہ بھی نہیں رہا ہوگا کہ آپ کی ماں نے کتنی تکلیفیں برداشت کر کے آپ کی پرورش کی ہوگی، آپ کے ہر ناز نخرے کو برداشت کیا ہوگا مگر جب آپ بڑے ہو جاتے ہیں تو آپ چھوٹی چھوٹی بات پر ناراض ہونے لگتے ہیں۔ ان کے ڈانٹنے کی وجہ سے کھانا نہیں کھاتے۔ گھر سے باہر چلے جاتے ہیں۔ وقت پر پڑھائی نہیں کرتے۔ آپ بس اتنا جان لیں کہ آپ کے والدین اگر آپ پر غصہ کرتے ہیں تو آپ کی بھلائی کے لیے کرتے ہیں۔ وہ بھی ان کی ایک طرح کی محبت اور شفقت ہوتی ہے کیونکہ ان کی ڈانٹ ہی آپ کے روشن مستقبل کی ضمانت ہے۔ اس لیے آپ سب اپنی ماں کا احترام کریں، ان کی باتوں کو سنیں اور ان کی ہدایتوں پر عمل کریں۔

اب آپ 'بچوں کی دنیا' کا مطالعہ کریں اور اپنی رائے اور مشوروں سے ہمیں ضرور آگاہ کریں۔ اسی ماہ میں ہولی جیسا خوبصورت تہوار بھی ہے۔ یہ رنگوں کا تہوار ہے، اس لیے رنگ کھیلتے وقت دھیان رکھیں کہ کسی کو پریشانی نہ ہو۔

آپ سب کو ہولی کی ڈھیر ساری مبارکباد!

آپ کا

عقیل احمد

ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

ڈاک خانہ

میں 'بچوں کی دنیا' پابندی سے دیکھتی ہوں اور اپنے بچوں کو پڑھاتی بھی ہوں۔ رسالے کے بلند معیار و مرتبے کو دیکھتے ہوئے میں بھی کچھ لکھنے کی طرف مائل ہوئی۔ گھریلو اور بچوں کی ذمے داریوں کے سبب لکھنے پڑھنے کے لیے بہت زیادہ وقت دینے سے قاصر رہتی ہوں، تاہم 'بچوں کی دنیا' رسالہ دیکھ کر بہت کچھ لکھنے کو جی چاہتا ہے۔ اس لیے وقتاً فوقتاً رسالہ 'بچوں کی دنیا' کے قارئین کے لیے کچھ تحریر کرنے کی ہمت کرتی ہوں جنوری 2020 کے شمارے میں میری نظم 'موسم سرما' آپ نے شائع کی جس کے لیے میں آپ کا شکریہ ادا کرتی ہوں۔ آئندہ بھی موقع فراہمی کی منتظر رہوں گی۔

فردوس بانو فلاحی، گلمرگ اپارٹمنٹ، ایم 109، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی

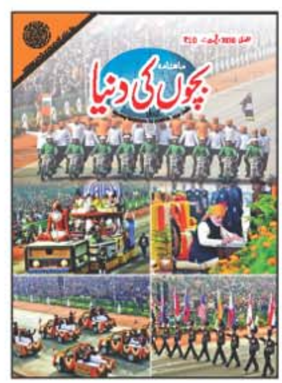

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان اردو کے نونہالوں کے لیے ماہنامہ 'بچوں کی دنیا' شائع کرتے ہوئے بنیادی کام کر رہا ہے۔ فروغ اردو میں آج ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ بچوں کے ادب پر بہت کم کام کیا جا رہا ہے اور بچوں کے لیے لکھنے والوں کی کمی محسوس کی جا رہی ہے۔ کونسل کی جانب سے بچوں کے لیے شمارہ نکالنے سے بچوں پر لکھنے والوں کو ایک بہترین پلیٹ فارم مل رہا ہے۔ جنوری کے شمارہ میں کامران غنی صبا نے 'یوم جمہوریت اور ہمارا آئین' مضمون کے ذریعہ دستور سازی کے عمل کے دوران ہمارے ملک کے حکمرانوں نے کتنی محنت کی ہے اس کو آسانی سے سمجھانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ وہاٹس ایپ کی کہانی کے ذریعہ نوجوانوں کو یہ پیغام دیا گیا کہ وہ کبھی ہمت نہ ہاریں اور مثبت سوچ وفکر کے ساتھ آگے بڑھیں۔ جنوری کے شمارہ میں تمام مضامین معلوماتی اور دل کو چھو جانے والے ہیں۔ گھر میں رسالہ کی آمد کے ساتھ ہی میرے بھانجا بھانجی فوری ذہنی مشق کا جو حصہ ہوتا ہے اس کو حل کرنے میں لگ جاتے ہیں۔ رسالہ کے ذمہ داروں سے درخواست ہے کہ وہ ذہنی مشق کے اسباق کو زیادہ سے زیادہ جگہ دیں تاکہ بچہ اس کو حل کرتے ہوئے اردو سیکھ سکے۔ تصاویر کے ذریعہ کہانی کو بھی بچے بہت پسند کرتے ہیں۔ اللہ سے دعا ہے کہ بچوں کا رسالہ دن دونی رات چوگنی ترقی عطا کرے۔

محسن خان، پان منڈی، حیدرآباد، تلنگانہ

بہت دنوں سے سوچ رہا تھا کہ آپ کو خط لکھوں۔ ماہنامہ 'بچوں کی دنیا' کا نومبر 2019 کا شمارہ ملا۔ میرا مضمون 'یہ تھے اقبال...' شائع کرنے کے لیے شکریہ۔ سارا شمارہ داد کے لائق تھا۔

خان احتشام آصف، 266 سنگم نگر، انٹاپ ہل، وڈالا، ممبئی

صغریٰ مہدی

پہلی قسط

اکبر الہ آبادی

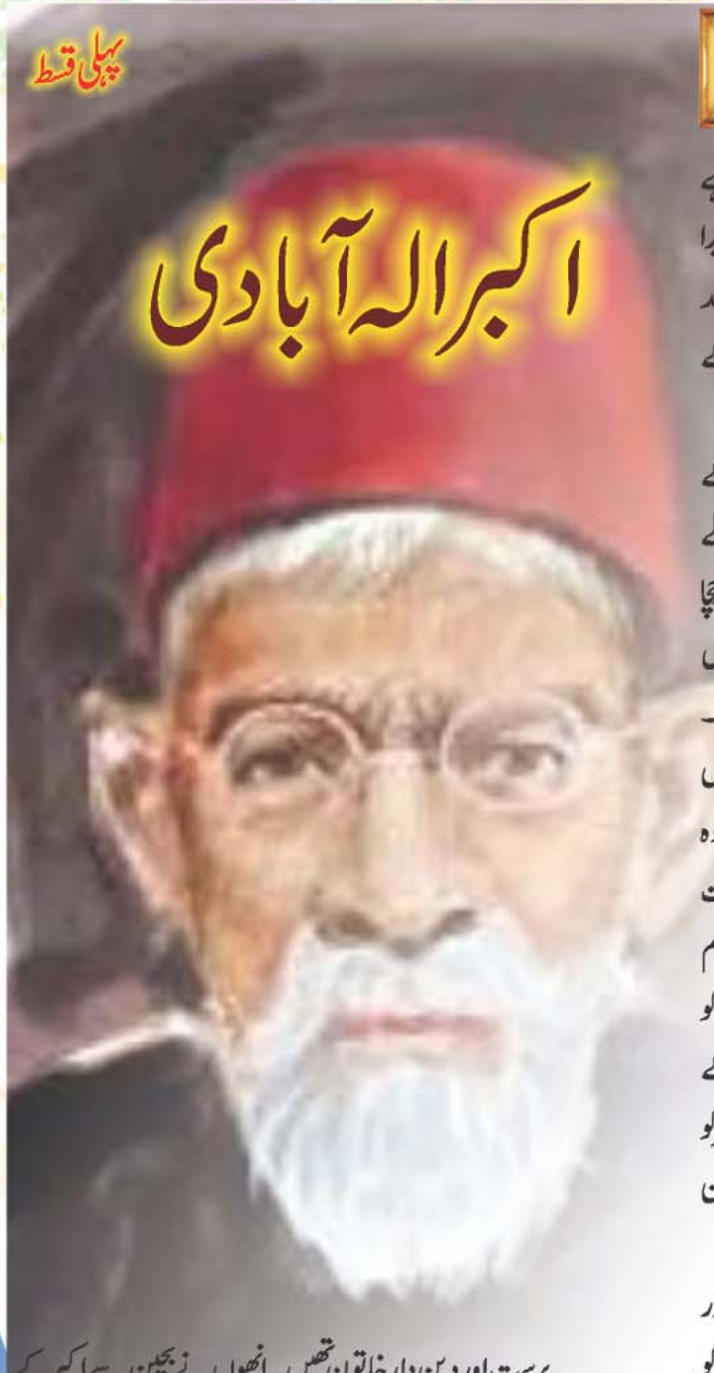

پہلا باب: پیدائش اور بچپن

الٰہ آباد کے ضلع میں ایک چھوٹی سی تحصیل ہے بارہ۔ اکبر 16 نومبر 1846 کو یہاں پیدا ہوئے۔ اُس دن عید کا دن تھا۔ اکبر کے والد تفضّل حسین، اپنے بڑے بھائی وارث علی کے ساتھ رہتے تھے، جو بارہ میں تحصیلدار تھے۔

اکبر کی پیدائش کے کچھ دن بعد ان کے خاندان کے لوگ داؤدنگر ضلع گیا (بہار) چلے گئے، جہاں اکبر کے دادا یعنی ان کے والد کے چچا رہتے تھے۔ اکبر کا ابتدائی بچپن داؤدنگر ہی میں گزرا۔ یہیں پر ان کی بسم اللہ[1] کی رسم ادا ہوئی۔ اس وقت ان کی عمر پانچ یا چھ سال کی تھی۔ انھوں نے پڑھنا شروع کیا تو یہ اندازہ ہوا کہ وہ غیر معمولی طور پر ذہین ہیں اور یادداشت بہت اچھی ہے۔ پڑھنے کے شوقین ہیں۔ مذہبی تعلیم کے علاوہ فارسی عربی اور اردو کے ساتھ ان کو ریاضی کی تعلیم بھی پڑھائی جانے لگی۔ اکبر کے والد تفضّل حسین ریاضی کے ماہر تھے۔ وہی اکبر کو پڑھاتے تھے۔ انھیں یہ جان کر خوشی ہوئی کہ ان کا بیٹا بھی حساب سیکھنے میں تیز ہے۔

اکبر کے ایک چھوٹے بھائی اکبر حسن اور ایک بہن سیدہ تھیں۔ یہ اپنے دونوں بھائی بہن کو بہت چاہتے تھے کیونکہ وہ ان دونوں سے بڑے تھے۔ اِس لیے ہمیشہ ان کا بہت خیال کرتے۔ ان کی ماں بہت نیک، خدا پرست اور دین دار خاتون تھیں۔ انھوں نے بچپن سے اکبر کے دل میں مذہب سے لگاؤ پیدا کیا اور مذہبی فرائض کی ادائیگی کی عادت ڈالی۔

بچپن میں اکبر کو دو کھیل بہت پسند تھے، ایک تو کبڈی، دوسرے جھوٹ موٹ کی عدالتیں بنا کر مقدموں کے فیصلے کرنا۔ دوسرے کھیلوں کا انھیں شوق نہیں تھا۔ اسی لیے وہ ہمیشہ دبلے پتلے رہے اور صحت بھی کمزور رہی۔

اکبر کے دادا سید محمد زماں فوج میں صوبیدار تھے اور ان کو خان بہادر کا خطاب بھی ملا تھا۔ اکبر کے والد سید محمد تفضّل حسین نے کچھ دنوں ملازمت کی مگر پھر چھوڑ دی۔ ان کو تصوف[2] سے خاص لگاؤ تھا۔ اِس لیے وہ تصوف سے متعلق کتابیں پڑھتے یا خدا کی عبادت میں اپنا وقت گزارتے ان کے بڑے بھائی سید وارث علی اور ان کے چچا فضل الدین نوکری کرتے تھے۔ دادا کا انتقال ہو چکا تھا۔ کچھ جائیداد تھی۔ اچھی طرح گزر بسر ہو جاتی تھی۔

اس زمانے میں خاندان کے سب لوگ عام طور پر ساتھ رہتے تھے اور یہ بات ضروری نہیں تھی کہ گھر کے سب افراد کمائیں۔ کچھ جائیدادیں ہوتی تھیں، کچھ لوگ ملازمتیں کر لیتے اور پورے خاندان کی گزر بسر ہو جاتی۔

جب اکبر کے دادا سید فضل الدین اپنی ملازمت کے سلسلے میں الہ آباد آئے تو سارا خاندان ان کے ساتھ الہ آباد آ گیا اور پھر یہیں رہنے لگا۔ ان لوگوں کا قیام الہ آباد میں چک نام کے محلے میں تھا۔ یہاں کے اکبر کے دادا سید فضل الدین نے ایک مسجد بھی بنوائی تھی۔

اکبر چونکہ شوقین بھی تھے اور ذہین بھی، اس لیے انھوں نے پڑھنا لکھنا جلدی سیکھ لیا۔ قرآن شریف پڑھنے لگے۔ اردو کی ضخیم[3] داستانیں جیسے الف لیلیٰ، قصہ حاتم طائی آٹھ سال کی عمر میں انھوں نے ختم کر لی تھی۔ محلے کی عورتیں اور مرد ان سے خط لکھوانے آیا کرتے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان میں انگریزوں کی باقاعدہ حکومت تو قائم نہیں ہوئی تھی مگر اصل میں وہی ہندوستان پر حکمران تھے۔ انھوں نے دھیرے دھیرے یہاں اپنا پورا تسلط[4] قائم کر لیا تھا۔ وہ نہ صرف ہندوستان کی حکومت ہتھیانے کی فکر میں تھے بلکہ اس کوشش میں بھی لگے ہوئے تھے کہ ہندوستانیوں کی تہذیب کو ختم کر کے یہاں پر اپنی تہذیب پھیلائیں۔

انگریزی تعلیم کا رواج ہو رہا تھا، اور اب ہندوستانی لوگ بھی یہ ضرورت محسوس کر رہے تھے کہ اپنے بچوں کو پرانی وضع کے بجائے انگریزی اسکولوں میں بھیجیں تاکہ وہ انگریزی پڑھ کر اچھی ملازمت حاصل کر سکیں۔ اس لیے اکبر کو بھی دس سال کی عمر میں الہ آباد میں جمنا مشن اسکول میں داخل کرا دیا گیا۔

اکبر کو یہ اسکول بہت پسند آیا۔ ان کا دل اس میں لگ گیا۔ اسکول میں یہ بہت اچھے چل رہے تھے۔ ان کے استاد ان سے بہت خوش تھے۔ ریاضی میں خاص طور سے اچھے نمبر لاتے تھے۔ مگر یہ سلسلہ ایک سال بعد ختم ہو گیا۔ اس لیے کہ 1857 کا ہنگامہ شروع ہو گیا یعنی آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کی قیادت میں ہندوستانیوں نے انگریزوں کو ملک سے باہر رہنے کی پہلی کوشش کی تھی جسے انگریزوں نے 'غدر' کا نام دیا لیکن دراصل یہ پہلی جنگِ آزادی تھی۔ اس لڑائی میں ہندوستان کے لوگ ہار گئے اور انگریز اب باقاعدہ پورے ہندوستان پر حکومت کرنے لگے۔ انھوں نے ان سب ہندوستانیوں کو سخت سزائیں دیں جنھوں نے اس لڑائی میں حصہ لیا تھا اور جس پر انھیں یہ شبہ بھی ہو گیا کہ یہ لوگ 'باغیوں'

کے طرفدار ہیں اور انگریزوں کی حکومت نہیں چاہتے ہیں۔ ان پر انھوں نے سخت ظلم کیے۔ ان کی پنشنیں بند کر دیں، جائیدادیں ضبط کر لیں۔ وہ ہندوستانی مسلمانوں سے زیادہ خوف زدہ تھے۔ ان کا خیال تھا کہ یہ لوگ اپنے ہاتھ سے حکومت آسانی سے دینے کو تیار نہیں ہیں۔

اس ہنگامے میں اکبر کی تعلیم کا سلسلہ بھی ختم ہو گیا۔ ان کی جائیداد ضبط ہو گئی۔ گھر کی مالی حالت خراب ہو گئی۔ اب اکبر کو ان کے والد نے اپنے ایک دوست کے سپرد کر دیا کہ ان کو عدالت کے لیے پروانہ[5] نویسی سکھا دیں۔ اکبر کی طبیعت کو اس کام سے فطری مناسبت تھی۔ اس لیے ان کا دل اس میں لگ گیا اور چند دن بعد جب یہ کام انھوں نے سیکھ لیا تو تھوڑا بہت کام بھی ملنے لگا۔

ملازمت

1859 میں الٰہ آباد کے مجسٹریٹ آر ڈبلیو آئی بنسن کی طرف سے اعلان ہوا کہ عدالت میں کچھ جگہیں خالی ہیں، جو لوگ ملازمت چاہتے ہوں اپنا نام امیدواروں میں لکھوائیں 'صاحب' انٹرویو لیں گے اور جو انٹرویو میں کامیاب ہوگا اس کو ملازمت مل جائے گی۔

اکبر کسی اچھی نوکری کی تلاش میں تھے، اس لیے وہاں پہنچ گئے۔ ان کا نام امیدواروں میں لکھ لیا گیا اور انٹرویو کے لیے انھیں روک لیا گیا وہ بیٹھ کر باہر انتظار کرنے لگے۔ بیٹھے بیٹھے تھک گئے۔ نہ اب بلایا جاتا ہے نہ تب۔ سب لوگ پریشان تھے۔ لوگوں نے ان سے کہا کہ ''تم اندر جا کر معلوم کرو کہ کیا دیر ہے۔ یہ اندر جا ہی رہے تھے کہ دیکھا بنسن صاحب باہر آ رہے ہیں۔ یہ گھبرا گئے اور بھاگ کھڑے ہوئے۔ بنسن صاحب نے چپراسی کو دوڑایا اور ان کو بلوا کر ان کا انٹرویو لیا اور ان کو نوکر رکھ لیا۔ اپنے بنگلے میں رہنے کو جگہ دی اور اپنے بیرے اور خانساماں کو خیال رکھنے کو کہا۔ اس طرح اکبر کو انگریزوں کے رہنے سہنے کے ڈھنگ کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ بنسن صاحب ان کے کام سے بہت خوش تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اگر یہ اسی طرح محنت اور ہوشیاری سے کام کرتے رہیں تو انھیں بہت جلد تحصیلدار بنا دیا جائے گا، مگر بنسن صاحب کا تبادلہ ہو گیا اور اکبر بیکار ہو گئے اور انھوں نے پھر ملازمت تلاش کرنی شروع کر دی۔ ملازمت پانے کے لیے انھیں ایک اور ناگوار واقعہ پیش آیا۔ ایک انگریز افسر کے دفتر کے باہر یہ انٹرویو کا انتظار کر رہے تھے، اور جب بہت دیر ہو گئی تو انھوں نے اکتا کر یہ دریافت کرنا چاہا کہ آخر انٹرویو کب ہوگا۔ اس کے جواب میں ان پر کتا چھوڑ دیا گیا۔ اکبر کو اس حرکت پر بہت غصہ آ گیا اور یہ وہیں اسی طرح کھڑے رہے۔ انگریز افسران کی اس ہمت سے بہت متاثر ہوا اور ان کو فوراً نوکری دے دی مگر اکبر کو نوکری ملنے کی زیادہ خوشی نہیں ہوئی۔ ان کو اس بات کا رنج اور دکھ تھا کہ انگریز ہندوستان پر حکومت کر رہے ہیں اور ہندوستانیوں کو ان ہی کے ملک میں ذلیل کر رہے ہیں۔ انھوں نے سوچنا شروع کیا۔ آخر کیوں انگریز ہم پر مسلط ہیں؟ اور ان کے دل میں انگریزوں کے خلاف نفرت کا جذبہ ابھرنے لگا۔ یہ ملازمت بھی عارضی تھی۔ تھوڑے دن کی بیکاری کے بعد پھر ان کو الٰہ آباد میں جمنا کے پل کی تعمیر کے سلسلے میں ایک ملازمت مل گئی۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ اس دوران اکبر برابر پڑھتے

رہے۔ رات کو دیر تک جاگ کر پڑھنا ان کی عادت بن گئی تھی۔ وہ شعر و ادب، تصوف، مذہبی کتب اور تاریخ و فلسفہ کا مطالعہ کرتے رہتے تھے۔ اس کے بعد انھوں نے وکالت کے ادنیٰ درجے کا امتحان پاس کیا اور الہ آباد میں باقاعدہ وکالت شروع کر دی مگر اکبر کے والد کی خواہش تھی کہ یہ وکالت کے بجائے تحصیلداری کریں۔ آخر کو ان کی کوششوں سے الہ آباد کے ضلع میں میجا کی تحصیل میں ان کو تحصیلداری کریں۔ آخر کار ان کی کوششوں سے الہ آباد کے ضلع میں میجا کی تحصیل میں ان کو تحصیلداری مل گئی۔ اکبر یہاں خوش نہیں رہے۔ ایک تو کام پسند کا نہیں تھا۔ پھر دوست احباب، خاندان سب سے دور تھے۔ یہ اس فکر میں تھے کہ وہ کس طرح وہاں سے بھاگیں مگر چونکہ یہ ملازمت بھی عارضی تھی، اس لیے ان کو وہاں سے جلدی چھٹکارا مل گیا۔

اکبر جس عدالت میں پہلے ملازم تھے وہاں ایک انگریز جج ٹرول صاحب تھے جو اکبر کی قابلیت، ذہانت اور کارگزاری سے بہت خوش تھے۔ ان کو یہ اندازہ تھا کہ اگرچہ ان کی تعلیم باقاعدہ اسکول اور کالج میں نہیں ہوئی ہے، مگر ان کی قابلیت حساب اور انگریزی میں اچھی ہے۔ قانونی معاملوں کو بھی خوب سمجھتے ہیں۔ چنانچہ ٹرول صاحب نے چیف جسٹس سے سفارش کر کے انھیں مثل خواں مقرر کرا دیا۔

خاندان کے لوگوں کی یہ رائے نہیں تھی کہ اکبر اس نو عمری میں اتنا بڑا عہدہ سنبھالیں۔ ان کو اس میں شبہ تھا کہ اکبر اتنی بڑی ذمہ داری اٹھا بھی سکیں گے یا نہیں۔ سب لوگوں نے اکبر کو منع کیا مگر یہ نہیں مانے۔

اکبر نے اسکول میں تھوڑی بہت انگریزی پڑھی تھی، اپنے طور پر کچھ سیکھ لی تھی۔ مثل خوانی کے کام میں اچھی انگریزی جاننے کی ضرورت تھی۔ اکبر نے دن رات محنت کر کے اپنی انگریزی کی قابلیت بڑھائی اور وہ بہت جلد انگریزی میں قانونی نکتوں کو بیان کرنے کے قابل ہو گئے۔ 1873 میں اکبر نے ہائی کورٹ کی وکالت کا امتحان دیا۔ یہ امتحان بہت مشکل تھا۔ بہت سے امیدواروں میں صرف چار پانچ امیدوار پاس ہوئے تھے۔ ان میں ایک اکبر تھے۔ اس امتحان کو پاس کرنے کے بعد وہ ہائی کورٹ میں وکالت کرنے لگے۔ اب بحیثیت وکیل اکبر کو لوگ جاننے لگے تھے۔ ان کا شمار اچھے مشہور وکیلوں میں ہونے لگا تھا۔ اب بڑے بڑے وکیل اپنے مقدموں میں انھیں شامل کرنے لگے تھے۔

الفاظ کی تشریح

1 پرانے زمانے میں مسلمانوں میں جب بچے کی تعلیم شروع ہوتی تو سب سے پہلے گھر کا کوئی عالم بزرگ یا پھر کوئی مولوی آکر بچے کو قرآن کی سورت پڑھاتا۔ جس بچے کی بسم اللہ ہوتی ہے اس کے نئے کپڑے بنائے جاتے ہیں۔ رشتہ داروں اور دوستوں کو بلایا جاتا ہے اور دعوت ہوتی ہے۔

2 دل میں خدا کی محبت اور اس کے قرب کی خواہش رکھنا۔

3 بہت موٹی

4 قبضہ

5 سرکاری حکم نامے لکھنا

6 قبضہ جمائے ہوئے ہیں۔

جاری

■

ماخوذ: اکبر الہ آبادی، **مصنف:** صغریٰ مہدی، **تیسری طباعت:** 2011، ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

خواجہ عبدالمنتقم

دارا شکوہ کی پیاری بہن
جہاں آرا
(23 مارچ 1614 – 16 ستمبر 1681)

ماں باپ کے بعد ہمارے سب سے قریبی عزیز ورشتہ دار ہمارے بھائی بہن ہوتے ہیں۔ اس کی بہت سی وجوہات ہیں۔ پہلی وجہ یہ کہ ہمیں ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہونے کا فخر حاصل ہوتا ہے۔ دوسرے یہ کہ عام طور پر ہم ایک ہی گھر میں رہتے ہیں۔ تیسرے یہ کہ عام طور پر ہمارے جذبات اور احساسات بھی لگ بھگ ایک ہی ہوتے ہیں۔ صرف یہی نہیں بچوں کا ایک دوسرے کے ساتھ اور اپنے ماں باپ کے ساتھ جذباتی رشتہ بھی ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ایک دوسرے کا خیال بھی رکھتے ہیں۔ اسی طرح جہاں آرا بھی دارا شکوہ کی پیاری بہن تھی اور وہ اس سے بے حد محبت کرتی تھی اور اس کا پورا پورا خیال رکھتی تھی۔

بچو! اب آپ پوچھو گے کہ جہاں آرا کون تھی؟ جہاں آرا مغل شہنشاہ شاہجہاں کی بیٹی تھی۔ وہ شاہجہاں کی سب سے بڑی اولاد تھی۔ شاہجہاں اس سے بہت محبت کرتے تھے۔ یہ وہی جہاں آرا ہے جس نے دہلی کے چاندنی چوک کا نقشہ تیار کیا تھا۔ یہ وہی جہاں آرا ہے جسے شاہجہاں نے بیگم صاحبہ کا خطاب دیا تھا۔ یہ وہی جہاں آرا ہے جس کی نگرانی میں بنا کھانا ہی شاہجہاں کو قابل قبول تھا۔ یہ وہی جہاں آرا ہے جسے شاہجہاں نے اپنے محل میں علیحدہ رہنے کی اجازت دی۔

جہاں آرا کی پیدائش تو اجمیر میں ہوئی تھی مگر پلی بڑھی آگرہ میں۔ اس وقت کے روایتی تعلیمی نظام کے مطابق اس نے گھر پر رہ کر ہی اپنے اساتذہ سے تعلیم حاصل کی۔ وہ قران کو اچھی طرح سمجھتی تھی اور اسے فارسی ادب کی بھی بہت اچھی جانکاری تھی۔ وہ اپنے بھائی دارا شکوہ کی طرح تصوف میں بھی یقین رکھتی تھی اور صوفیا کا بہت احترام کرتی تھی۔ وہ پیر و مرشد

ملا شاہ بدخشی کی مرید بھی رہی۔ وہ ایک مصنفہ بھی تھی۔ اس نے ملا شاہ بدخشی اور خواجہ معین الدین چشتی کی سوانح (زندگی کے حالات) بھی لکھی۔ جہاں آرا نے اجمیر شریف کی زیارت کے موقع پر خود کو 'فقیرہ' کہا اور خود کو ایک صوفی خاتون مانا۔ وہ کہا کرتی تھی کہ وہ خود اور اس کا بھائی دارا شکوہ دونوں ہی تیموری خاندان کے وہ افراد ہیں جنھوں نے صوفی طریقہ اپنایا ہے۔ جہاں آرا نے صوفی ادب کی ترتیب کے ساتھ ساتھ کچھ قدیم اہم کتابوں کے ترجمے بھی کرائے۔

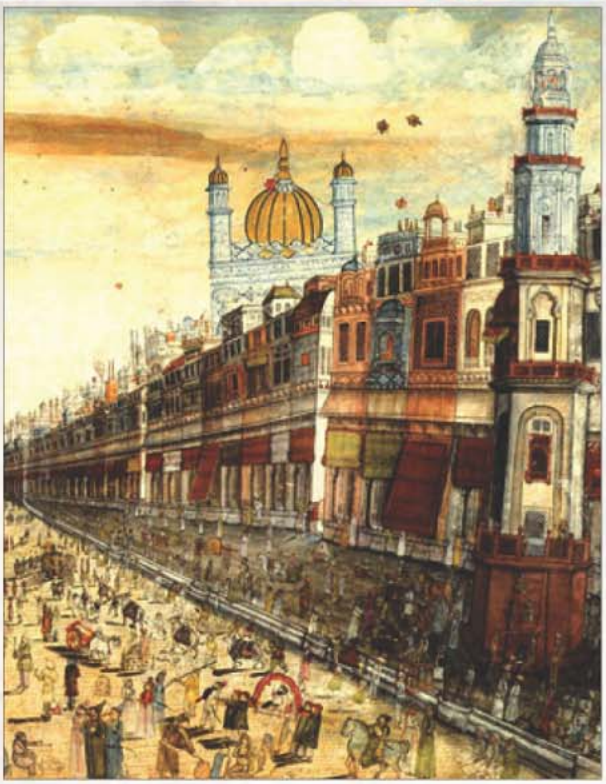

جہاں آرا اپنے بھائی اورنگ زیب سے خوش نہیں تھی اور کبھی کبھی اس کے لیے رسوا کن الفاظ بھی استعمال کرتی تھی۔ جہاں آرا کا میلان 'دارا شکوہ' کی طرف تھا، تو اس کی بہن روشن آرا اورنگ زیب کو سلطان دیکھنا چاہتی تھیں۔ جہاں آرا دارا شکوہ کو بہتر انسان سمجھتی تھی۔ وہ اسے روشن خیال، تمام مذاہب کا احترام کرنے والا شخص سمجھتی تھی اور وہ دراصل ایک اعتدال پسند انسان تھے بھی۔ جب اورنگ زیب مغلیہ سلطنت کا جانشین ہوا تو اس کے حکم سے شاہ جہاں کو قید کر لیا گیا۔ جہاں آرا اپنے والد کے ساتھ قید میں رہا کرتی تھی اور والد کی تیمارداری کیا کرتی تھی۔ شاہ جہاں کی وفات تک جہاں آرا اپنے والد کی خدمت کرتی رہی۔ یہ بات دوسری ہے کہ شاہ جہاں کی وفات کے بعد اورنگ زیب اور جہاں آرا کے درمیان کشیدگی کم ہوگئی اور اورنگ زیب نے جہاں آرا کو صاحب - شاہزادی کا لقب بھی دیا۔ جہاں آرا صاف گو، بے خوف اور سچ بولنے والی خاتون تھی۔ وہ اورنگ زیب پر نکتہ چینی سے بھی نہیں گھبراتی تھی۔

جہاں آرا بہت سادہ مزاج تھی۔ اس نے تو اپنی قبر کو بھی سادہ رکھنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ درگاہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیا کے احاطہ میں آج بھی اس کی قبر پر صرف سبز گھاس ہی اس کی سادہ مزاجی کی ہمہ وقت گواہی دے رہی ہے۔

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

■

Khwaja Abdul Muntaqim
H-3, Dharma Apartments
2-I.P Extn
Delhi - 110092

ڈیل کارنیگی

او او مکن ٹائر

دو کروڑ لوگ اس کا اخباری کالم ہر روز پڑھتے تھے لیکن وہ مداحوں کے سامنے آنے سے بے حد گھبراتا تھا۔

کئی سال تک او، او، مکن ٹائر اپنے اخباری کالم 'روزمرہ کے نیویارک' کے سبب بڑا مشہور رہا۔ چار سو اٹھانوے اخبار اس کالم کو شائع کرتے تھے اور تقریباً دو کروڑ لوگ اس کا یہ کالم ہر روز پڑھتے تھے۔

وہ نیویارک کی روزمرہ زندگی کا بہترین مبصر تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ مسوری میں پیدا ہوا اور چوبیس سال کی عمر سے پہلے اسے نیویارک آنے کا موقع نہ ملا۔ لاکھوں لوگوں کے نزدیک مکن ٹائر کئی سال تک نیویارک کا مقبول ترین آدمی رہا۔

ایک دفعہ مجھے ٹیکساس کے شہر امیریلو میں جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں میں نے دیکھا کہ وہاں کے لوگ نیویارک کے محض دو آدمیوں کے بارے میں باتیں کرتے تھے۔ ایک او، او، مکن ٹائر اور دوسرا آرتھر، بیرس مین۔

لوگ لفافے پر مکن ٹائر کی تصویر لگا کر اس پر کسی قسم کا پتہ لکھے بنا لیٹر بکس میں ڈال دیتے اور وہ لفافہ اسے مل جایا کرتا تھا۔ اسے ہر ہفتے اس قسم کے تین چار خط ملا کرتے تھے۔

مکن ٹائر عجیب وغریب شخصیت کا مالک تھا۔ مثال کے طور پر جس اخبار میں اس نے کئی سال ملازمت کی اور جہاں سے وہ چار سو تیس پونڈ فی ہفتہ تنخواہ لیتا رہا اس کے مالک سے وہ اس سارے عرصے میں صرف تین دفعہ ملا۔ وہ اپنی تحریروں کے زور پر ایک سال میں بیس ہزار پونڈ کماتا تھا۔ اس کے باوجود اس کے پاس کوئی اسٹینوگرافر نہیں تھا۔ وہ اپنے مضمون خود ہی لکھتا تھا۔

اس کی تنخواہ امریکہ کے صدر سے زیادہ ہوتی تھی۔ اس کے باوجود اس نے کبھی اپنے دفتر کی پرواہ نہ کی۔ حالانکہ اس کا ایک آفس بھی تھا لیکن وہ کبھی وہاں نہیں گیا تھا۔ وہ اپنا سارا کام گھر پر ہی کیا کرتا تھا۔ مکن ٹائر کی کبھی یہ خواہش نہیں رہی تھی کہ

وہ ریڈیو پر تقریر وغیرہ کرے حالانکہ اسے ایک سال کے اندر ریڈیو کے اکتیس معاہدے پیش ہوئے تھے۔ ایک دفعہ تو ریڈیو والوں نے یہاں تک کہہ دیا کہ وہ اس کے دفتر میں مائیکروفون لگا دیں گے اور سو پونڈ فی منٹ کے حساب سے تقریر کرنے کا معاوضہ دیں گے لیکن وہ نہ مانا۔

وہ فلموں میں بھی کام نہ کرنا چاہتا تھا۔ حالانکہ کئی سال تک ہالی ووڈ والے اس کے پیچھے پڑے رہے۔ وارنر برادرز والے اس سے اپنی ایک فلم میں کام کروانے پر تل گئے۔ لیکن وہ ہر دفعہ انکار کرتا رہا۔ آخر کار انھوں نے اسے ایک خالی چیک بھیج دیا کہ وہ اپنے ہاتھوں سے اس پر جتنی رقم چاہے بھر سکتا ہے لیکن اس نے وہ چیک بھی واپس کر دیا۔

ایک مرتبہ میں نے اس سے پوچھا کہ اس نے اتنے عظیم مواقع کیوں ہاتھ سے گنوا دیے تو اس نے جواب دیا "دراصل مسئلہ یہ ہے کہ مجھے بولنا نہیں آتا۔" اس نے مجھے بتایا کہ ایک دفعہ ایک دعوت کے موقع پر اس نے تقریر کرنی چاہی تو وہ اس قدر گھبرا گیا کہ اس کے حلق میں الفاظ اٹکنے لگے اور وہ ایک بھی لفظ نہ کہہ سکا۔

اس کے خیال میں اگر وہ ریڈیو پر پروگرام کرنا شروع کر دے یا فلموں میں کام کرنا شروع کر دے تو ناکام ہو جائے گا۔ اس کے علاوہ حکومت کو اس کی آمدنی کا اسی فیصد بطور ٹیکس وصول کر لینا تھا۔ چنانچہ وہ کیوں سر کھپاتا پھرے۔

مکن ٹائر پٹس برگ میں پیدا ہوا جہاں اس کا باپ ایک ہوٹل چلاتا تھا۔ وہ تین سال کا تھا کہ اس کی ماں انتقال کر گئی۔ اس لیے اس کی نانی اسے اپنے ساتھ گیلی پولس لے گئی۔ بعد میں مکن ٹائر ایک ہوٹل میں کلرک کے طور پر کام کرنے لگا۔ اس ہوٹل میں اکثر نیویارک سے آنے والے مسافر ٹھہرتے تھے جو بڑے اعلیٰ لباس میں ہوتے تھے۔ مکن ٹائر ان کے لباس سے بڑا متاثر ہوا اور اس نے بھی نیویارک جانے کا فیصلہ کر لیا۔

اس کے پاس اتنے پیسے نہیں تھے کہ وہ سفر کر سکتا لیکن ایک چیز اس کے پاس تھی اور وہ چیز بہت تھوڑے لوگوں کے پاس ہوتی ہے۔ اس کے اندر جوان جذبات کی آگ روشن تھی۔ نیویارک کے بارے میں اسے جس قدر کتب ملیں وہ اس نے پڑھ ڈالیں۔ پھر 'اوہیو' میں کئی سال تک مختلف اخبارات میں کام کرنے کے بعد 'مین ہنٹرف' آیا اور مینسٹن نامی رسالے میں کام شروع کیا لیکن تین ماہ کے بعد ہی وہ رسالہ بند ہو گیا۔ پھر 'ایوننگ میل' میں پروف ریڈر کے طور پر کام کرنے لگا کیونکہ یہ کام اس کے مزاج کے خلاف تھا اس لیے اس نے دل لگا کر کام نہ کیا، اور اسی لیے اسے اس ملازمت سے فارغ کر دیا گیا۔

پھر اس نے اپنی خواہش کے مطابق کام کرنا شروع کر دیا اس نے نیویارک کے متعلق ہر روز ایک مضمون لکھنا شروع کر دیا لیکن کوئی اس کے مضمون چھاپنے کو تیار نہ ہوا۔ آخر بڑی مشکل سے وہ چند ایک اخبارات میں انھیں شائع کرانے میں کامیاب ہو گیا۔ پھر آہستہ آہستہ اس کے مضامین کی مانگ بڑھ گئی اور اس قدر بڑھ گئی کہ وہ دنیا کا مقبول اور مصروف ترین صحافی بن گیا۔

مکن ٹائر کے بارے میں ایک عجیب بات یہ ہے کہ حالانکہ وہ شہر کے سب سے زیادہ آبادی والے علاقے میں رہتا تھا لیکن وہ ہجوم سے بے پناہ نفرت کرتا تھا۔ وہ لوگوں سے ملنے سے گھبراتا تھا۔ ایک سال تک وہ اپنے ہوٹل سے باہر نہ آیا۔

اس کے دوست اسے لباس زیب تن کرنے کی ترغیب دیتے پھر اس کے ہاتھ میں چھڑی دے کر اسے باہر لانے کی کوشش کرتے لیکن وہ ہوٹل کے بیرونی دروازے تک ان کے ساتھ آ کر واپس چلا جاتا۔

ماہرین نفسیات اس قسم کے خوف کو آدم بیزاری کا نام دیتے ہیں۔ مکن ٹائر نے مجھے بتایا کہ وہ کئی سال چھپ چھپا کر تھیٹر جاتا رہا تا کہ اسے کوئی دیکھ نہ سکے۔ اگر لوگ اسے دیکھ کر پہچان لیتے تو وہ ہجوم میں گھبرا جاتا اور اس کے ہاتھ پاؤں پھول جاتے۔ مکن ٹائر نہ شراب پیتا تھا نہ ہی سگریٹ کو ہاتھ لگاتا۔ وہ اکثر چیونگم کھاتا رہتا تھا۔ اس کے پاس ایک رولس رائس تھی لیکن وہ زیادہ تر پیدل ہی چلا کرتا تھا۔ اس نے ہر روز کم از کم تین میل پیدل چلنا اپنی عادت بنالی تھی۔

نیویارک کا بہترین درزی اس کا لباس سیتا تھا۔ اس کے پاس اتنے اعلیٰ لباس تھے کہ پرنس آف ویلز دیکھ کر رشک کرتا لیکن وہ سارا دن اپنے ڈریسنگ گاؤن اور پاجامے میں ملبوس اپنا کام کرتا رہتا تھا۔ اس نے بس ایک لڑکی سے محبت کی اور اسی سے شادی کی۔ شادی کے وقت وہ چوبیس سال کا تھا۔

■

ماخذ: مانیں نہ مانیں: ڈیل کارنیگی

Subscription Form "Bachon Ki Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں بچوں کی دنیا' کا رکی سالانہ خریدار بننا چاہتا رچاہتی ہوں۔

100 روپے کا ڈرافٹ/منی آرڈر........................ ....بتاریخ...

بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

میں نے زرِتعاون سالانہ -/100 روپے A/C: 90092010045326، IFSC: SYNB0009009

میں جمع کروادیا ہے۔

آپ 'بچوں کی دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : ....

پتہ : ....

....

....

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں:

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159, E-mail.:sales@ncpul.in

دستخط

انتخاب بن تنویر

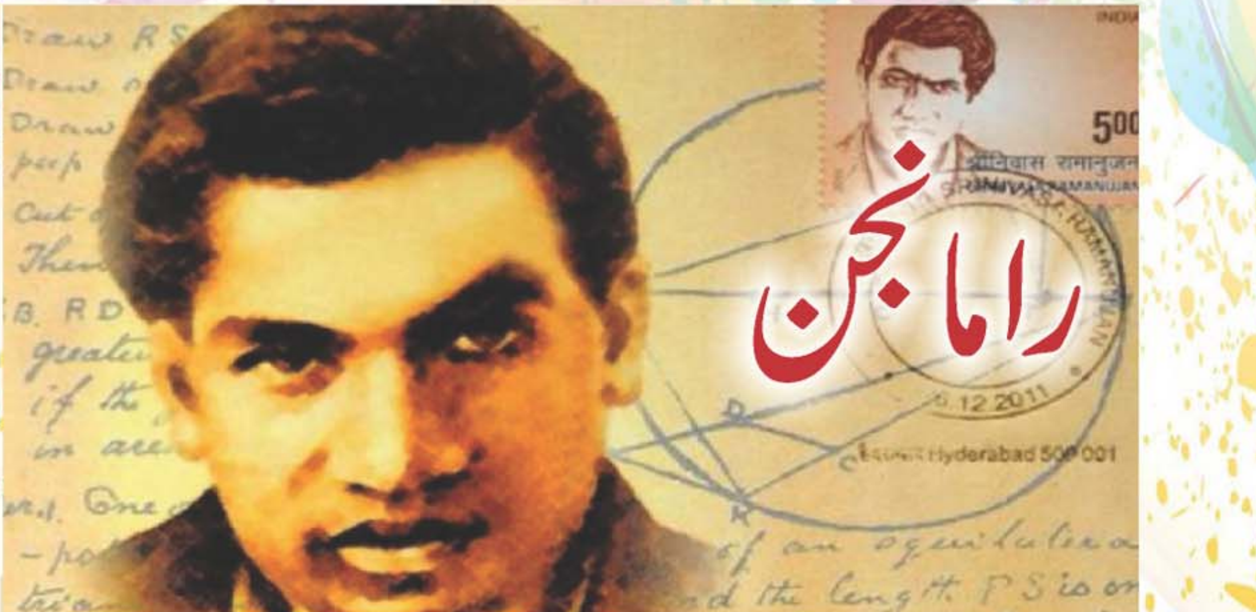

رامانجن

رامانجن کا یوم پیدائش 'نیشنل میتھ میٹکس ڈے' کے طور پر منایا جاتا ہے۔ یہاں ہم رامانجن کی زندگی سے وابستہ چند دلچسپ اور حوصلہ افزا واقعات کے بارے میں جانیں گے۔

رامانجن کی پیدائش 22؍دسمبر 1887 کو تمل ناڈو کے کوئمبٹور ضلع کے ایروڈ نامی گاؤں میں ہوئی تھی۔ ان کا پورا نام تھا شرینواس رامانجن اینگر۔ بچہ رامانجن تین سال کی عمر تک بولنا بھی نہیں سیکھ پایا تھا، لیکن اسی بچے نے ریاضی داں کے طور پر پوری دنیا میں اپنی پہچان بنائی۔

رامانجن کو بچپن سے ہی سوالات پوچھنے کا شوق تھا۔ دنیا کا پہلا انسان کون تھا؟ زمین و آسمان کا فاصلہ کتنا ہے؟ سمندر کتنا گہرا اور کتنا بڑا ہے؟ ایسے سوالات پوچھ کر وہ اپنے اساتذہ کو بھی حیرت میں ڈال دیتے تھے۔

وہ اعلیٰ اخلاق کے مالک تھے۔ ان کا کچھ تندرست جسم اور تجسس سے چمکتی آنکھیں انہیں ایک الگ پہچان دیتی تھیں۔ ان کے دوستوں کے مطابق ان کا اخلاق اتنا اچھا تھا کہ کوئی ان

شروع شروع میں ان کا دل پڑھائی میں نہیں لگتا تھا، لیکن دھیرے دھیرے پڑھائی میں ان کی دلچسپی جاگی اور پرائمری امتحان میں انھوں نے پورے ضلع میں اول مقام حاصل کیا۔ آگے کی تعلیم کے لیے ہائیر سکنڈری اسکول گئے، یہیں سے حساب (ریاضی) کی تعلیم کی ابتدا ہوئی۔

ان کی صلاحیت نے دوسرے طلبہ اور اساتذہ پر اپنی چھاپ چھوڑنا شروع کردی۔ انھوں نے اسکولی اوقات میں ہی کالج سطح کے میتھ کو پڑھ لیا تھا۔ ہائی اسکول کا امتحان پاس کرنے کے بعد حساب اور انگریزی میں اچھے مارکس لانے کے سبب انھیں 'سبرمنیم اسکالرشپ' ملی اور آگے کی تعلیم کے لیے کالج میں داخلہ بھی ملا۔

ریاضی میں ان کا رجحان اس قدر بڑھا کہ دوسرے مضامین پر انھوں نے دھیان دینا کم کردیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ گیارہویں درجہ میں میتھ میں تو ٹاپ کرلیا، لیکن باقی سبھی مضامین میں وہ فیل ہوگئے، جس کے سبب ان کو اسکالرشپ

ملنا بند ہوگئی۔

گھر کی معاشی حالت خراب تھی اور اسکالرشپ نہیں ملنے کی وجہ سے رامانجن کے لیے یہ بڑا ہی مشکل وقت تھا۔ گھر کی حالت سدھارنے کے لیے انھوں نے میتھ کا ٹیوشن کرنا شروع کیا اور اکاؤنٹس کا بھی کام کیا۔

کئی برسوں کی دوڑ دھوپ کے بعد مدراس پورٹ ٹرسٹ میں انہیں کلرک کی ملازمت ملی۔ اس ملازمت میں انھیں میتھ کے لیے کافی وقت مل جاتا تھا۔ رامانجن رات بھر جاگ کر ریاضی کے نئے نئے فارمولے لکھا کرتے تھے اور تھوڑی دیر آرام کرکے پھر دفتر کے لیے نکل جاتے تھے۔ رامانجن میتھ کے ریسرچ کو سلیٹ پر لکھتے اور بعد میں اسے ایک رجسٹر میں درج کر لیتے تھے۔ رات کو رامانجن کے سلیٹ اور چاک کی آواز سے گھر کے افراد کی نیند میں بھی خلل پڑتا تھا۔

رامانجن نے اپنے عددی اصولوں کے کچھ فارمولے پروفیسر شیشوایّر کو دکھائے تو ان کا دھیان لندن کے ہی پروفیسر ہارڈی کی طرف گیا۔ پروفیسر ہارڈی اس زمانے کے عالمی شہرت یافتہ ریاضی دانوں میں سے ایک تھے اور اپنے سخت رویّے اور نظم وضبط کی وجہ سے ان کی ایک پہچان تھی۔ ہارڈی کے ریسرچ (تحقیق) کو پڑھنے کے بعد رامانجن نے بتایا کہ انھوں نے پروفیسر ہارڈی کے سوالوں کے جواب تلاش کر لیے ہیں۔ پروفیسر ہارڈی نے اس وقت کے زیادہ تر حساب دانوں کو 100 میں 35 نمبر دیے اور کچھ خاص لوگوں کو 60 نمبر دیے، لیکن رامانجن کو 100 میں پورے 100 نمبر دیے۔

رامانجن کی یادداشت (میموری) غضب کی تھی۔ ایک بہت ہی مشہور واقعہ ہے۔ جب رامانجن اسپتال میں بھرتی تھے تو پروفیسر ہارڈی انہیں دیکھنے آئے۔ پروفیسر ہارڈی جس ٹیکسی میں آئے تھے، اس کا نمبر تھا 1729۔ یہ عدد پروفیسر ہارڈی کو منحوس لگا کیونکہ 1729=7x13x19 اور انگلینڈ کے لوگ 13 کو ایک منحوس عدد مانتے ہیں۔ لیکن رامانجن نے کہا کہ یہ تو ایک حیرت انگیز عدد ہے۔ یہ وہ سب سے چھوٹا عدد ہے جسے ہم دو مکعب (Cubic) عددوں کے جوڑ سے، دو طریقوں سے ظاہر کر سکتے ہیں۔ یعنی

1729 = 12x12x12x + 1x1x1 (1)

1729 = 10x10x10 + 9x9x9 (2)

کچھ اور جانکاریاں:

★ ریاضی میں 1729 کو 'رامانجن نمبر' سے جانا جاتا ہے۔

★ ریاست تامل ناڈو میں رامانجن کے جنم دن کو ITDay اور بھارت میں National Mathematics Day کے طور پر منایا جاتا ہے۔

★ سرینواس رامانجن کو Man Who knew Infinity کہا جاتا ہے۔

★ 2014 میں تمل زبان میں 'رامانجن کی زندگی' نام کی فلم بنائی گئی تھی۔

★ 2015 میں ان پر ایک اور فلم بنی، جس کا نام تھا: The man who knew Infinity

★ 26/اپریل 1920 کو محض 33/سال کی چھوٹی سی عمر میں ان کا انتقال ہوگیا۔

■

Intekhab Bin Tanweer
59, Chuna Shah Colony,
P.O.:Maango
Jamshedpur-831012(Jharkhand)

مظفر حنفی

ہولی نئ بہار کا پیغام لائی ہے

گلشن پہ رنگ و نور کی بدلی سی چھائی ہے
پودوں کو ہے خمار ہوا پی کے آئی ہے
پھولوں کو دیکھیے تو عجب دلربائی ہے
رنگینیوں سے آج مری آشنائی ہے
ہولی نئی بہار کا پیغام لائی ہے

کانٹوں کو بھی عبیر لگاتی ہوئی کلی
اُڑتا ہوا گلال فضا میں کلی کلی
ہر سمت ناچتی ہوئی مستوں کی منڈلی
میٹھی مغلظات ہیں، نغمہ سرائی ہے
ہولی نئی بہار کا پیغام لائی ہے

ہنستے ہیں یار لوگ حسینوں کے حال پر
کاجل لگا ہے کان میں سندور گال پر
دس بیس کا ہجوم مٹھائی کے تھال پر
ٹیسو کی بالٹی پہ بھی زور آزمائی ہے
ہولی نئی بہار کا پیغام لائی ہے

رعنائیوں کی بات گلِ تر سے پوچھیے
مستی کا حال بادہ و ساغر سے پوچھیے
کیسا تھا سیلِ رنگ مظفر سے پوچھیے
اشعار کہہ رہے ہیں کہ ہولی منائی ہے
ہولی نئی بہار کا پیغام لائی ہے

■

Prof. Muzaffar Hanfi
D-40, Batla House
New Delhi - 110025

رام داس

نظم

غریب اور امیر بچے

(مکتب کے طلبا و طالبات کے لیے)

املی کی رُت میں اکثر
دیکھے عجیب منظر
جب آئی بیر کی رُت
اِملی کے ڈھیر کی رُت
رہتے بس اے سی ہی میں
گھر پر امیر بچے!!
ان سے الگ سڑک پر
مفلس، غریب بچے
چنتے کچھ بیر، املی
کھاتے کچھ بیر، املی
کچھ املیوں کو چن کے
خوش ہو رہے تھے ایسے
اللہ کی طرف سے
نعمت ملی ہو جیسے
برعکس ان کے، یارو!
سارے امیر بچے
اے سی (ایئر کولر) میں
یوں ٹی، وی دیکھتے تھے
کچھ گیم کھیلتے تھے
جب بھوک لگتی تھی تو
وہ فریج سے فروٹ نکال کے کھاتے تھے
اور فریج سے ڈرنکس نکال کے پیتے تھے
یارو، ابھی بھی دیکھو!
مفلس، غریب بچے
پگڈنڈیوں پہ چنتے ہیں بیر
کھیتوں میں ہیں یہ بیروں کے ڈھیر
لیکن امیر بچے
اپنے گھروں میں اب بھی
موبائلوں سے کھیلا کرتے تھے
اور بھوک پیاس لگنے پر وہ سب
اپنے فریج سے ٹھنڈا کھانا
اکثر نکال کر کھاتے ہیں!!

■

Dr. Ramdas (Dr. Jawed Ashraf)
Faiz Building
Khadija Aursing Home Ranchi Hill Side
Imam Bara road, Ranchi - 834001

نظم

کیسی خالق ہو...

کیسی خالق ہو ذرا سامنے آؤ تو سہی
اپنی تخلیق سے نظروں کو ملاؤ تو سہی

جبر کے رنگ دکھاتا ہے زمانہ ہم کو
تختۂ مشق بناتا ہے زمانہ ہم کو
ہم جو حامی نہیں آوارگیِ نسواں کے
فخر کے ساتھ مٹاتا ہے زمانہ ہم کو
تم بھی اولاد کی عظمت کو بچاؤ تو سہی
کیسی خالق ہو ذرا سامنے آؤ تو سہی
ہم سے شاداب ہے ممتا کا چلن بھول گئیں
ہم سے قائم ہے محبت کی پھبن بھول گئیں
ہم نے ہر حال میں رشتوں کا بھرم رکھا ہے
ہم سے روشن ہے تقدس کا چلن بھول گئیں
تم بھی دنیا کو یہ احساس دلاؤ تو سہی
کیسی خالق ہو ذرا سامنے آؤ تو سہی

اب تو تم نے بھی زمانے کا چلن سیکھ لیا
کوکھ میں ہم کو مٹانے کا چلن سیکھ لیا
تم نے یہ کیا کیا شیدائی مغرب ہوکر
خونِ اولاد بہانے کا چلن سیکھ لیا
اپنے کردار کو آئینہ دکھاؤ تو سہی
کیسی خالق ہو ذرا سامنے آؤ تو سہی
اپنے کردار پہ اب ظلم سہو گی کب تک
صرف تقلید کے دھارے میں بہوگی کب تک
توڑ کر دائرۂ فکر نکل بھی آؤ
مشرقی قدروں سے اب دور رہوگی کب تک
دل کی آواز کو ہونٹوں پہ سجاؤ تو سہی
کیسی خالق ہو ذرا سامنے آؤ تو سہی

■

Shariq Adeel
MoH, Chobdar
P.O: Marehra
Distt: Etah - 207401 (UP)

اشفاق کارنجوی

محنت کا پھل

وہ جو مفلس غریب ہے یارو ایک بیوہ عجیب ہے یارو
اس ابھاگن کے بھاگ کو چھینا زندگی نے سہاگ کو چھینا
اتفاقاً جو ایک لڑکا ہے اس کی جاگیر نیک لڑکا ہے
جو کمانے کو کھیت جاتی ہے اپنی محنت کا پھل وہ پاتی ہے
اس طرح پل رہے ہیں دونوں بھی ہم قدم چل رہے ہیں دونوں بھی
سختیاں موسموں کی سہتے ہیں ایک ٹوٹے مکاں میں رہتے ہیں
ان کے جسموں کو جو جلاتی ہے چھت سے چھن چھن کے دھوپ آتی ہے
بادلوں کی عجب نوازش میں چھت ٹپکتی ہے ان کی بارش میں
راز ظاہر یہ ہوگیا سب میں جب وہ داخل ہوا ہے مکتب میں
فطرتاً ہوشیار بچہ ہے پڑھنے لکھنے میں خوب اچھا ہے
اس کے نقاد ہیں عجیب و غریب اس کے استاد ہیں عجیب و غریب
امتحاں جب دیا ہے انگلش سے اس نے ایم۔ اے کیا ہے انگلش سے
آج بھی کررہا ہے سروس وہ ایک کالج میں ہے مدرّس وہ
تَن کے اچھوں میں من کے سچوں میں وہ ہے خوش اپنے بال بچوں میں
دیکھ کر ماں کو مسکراتا ہے اور جھولے میں وہ جھلاتا ہے
اپنا گھر خود ہی جو چلاتی ہے ایک بیوہ بھی جب کماتی ہے
بات کیا ہے کہ علم دانوں میں حوصلہ ہی نہیں جوانوں میں
منھ نہ غیروں کے یونہی تکنا بازوؤں پر یقین کرنا تم ■

Ashfaq Karanjvi
G N Azad Urdu High School
Bare Gaon, Talluqa Balapur
Distt: Akola (Maharashtra)

اک چوہے کی فریاد

امان الحق بالاپوری

ذرا بتا اے شیر کی خالہ
میں نے تیرا کیا ہے بگاڑا
سامنے تیرے جب آتا ہوں
لقمہ تیرا بن جاتا ہوں
جانے کیوں ہے تیرا پنجہ
موت کا میرے لیے شکنجہ
نام سے تیرے لگتا ہے ڈر
گھومتے ہیں آنکھوں میں خنجر
جب ہم میں کچھ بیر نہیں ہے
پھر میری کیوں خیر نہیں ہے
ایک ہے ہم دونوں کا مسکن
پھر کیوں ہیں ہم دونوں دشمن
عرض مری ہے تجھ سے خالہ
نفرت کا منہ کردے کالا
مان لے میرا اتنا کہنا
سیکھ لے تو بھی پیار سے رہنا

■

Amanul Haq Balapuri
Jawlibase Shaher
At Post Balapur - 444302
Distt.: Akola (Maharashtra)

علم اب انگلیوں کی زینت ہے

رؤف خیر

علم ہی تو ہے سیکھنا ہم کو
دکھ اٹھانے کی کیا ضرورت ہے
اب گلوبل ولیج ہے دنیا
چین جانے کی کیا ضرورت ہے
کچھ بھی پردے میں اب رہا ہی نہیں
علم و فن آگئے ہیں پردے پر
جانسن، شیکسپیئر، پو، ملٹن
ہاتھ باندھے کھڑے ہیں پردے پر
غالب و میر و حالی و اقبال
رنگ اپنے لیے ہیں پردے پر
جھوٹ سچ لیڈروں کی تقریریں
ناچ گانے ملے ہیں پردے پر
عقل حیراں ہے دیکھ کر جن کو
نت نئے تجربے ہیں پردے پر
ایک کی بورڈ کی کرامت ہے
علم اب انگلیوں کی زینت ہے
زندگی خیر محوِ حیرت ہے
چین جانے کی کیا ضرورت ہے

■

Dr. Raoof Khair
Moti Mahal, Golconda
Hyderabad - 500008 (Telangana)
Cell: 9440945645

ہندی کہانی: یش پال، اردو ترجمہ: محمد اطہر مسعود خان

کہانی

پیار کی جیت

ویسے تو ان کا نام رحمت اللہ خاں تھا، لیکن چھوٹے بڑے انھیں 'مولوی صاحب' کہہ کر پکارتے تھے۔ تھوڑی سی آبادی کی بستی تھی اور کوئی خاص بات اس بستی میں نہ تھی۔ نہ پکی سڑک، نہ بجلی اور نہ دواخانہ لیکن پھر بھی مولوی صاحب کو اس گاؤں سے بہت لگاؤ تھا۔ وجہ یہ تھی کہ وہ اسی گاؤں میں پیدا ہوئے تھے اور وہیں کی مٹی میں کھیل کود کر بڑے ہوئے تھے۔

اس گاؤں سے ان کی محبت کی ایک اور وجہ بھی تھی، وہ یہ کہ ان کا اکلوتا بیٹا کریم بھری جوانی میں وہیں ان سے ہمیشہ کے لیے بچھڑا تھا اور اس کی یاد میں انھوں نے ایک چھوٹی سی یادگار گاؤں کے باہر بنوادی تھی۔ اس طرح اپنی سرکاری نوکری سے جب وہ فارغ ہوئے تو انھوں نے اسی گاؤں میں ایک مدرسہ کھول لیا اور بڑے پیار سے بچوں کو پڑھانے لگے۔ بچوں سے مولوی صاحب کو بہت محبت تھی اور بچے بھی ان کا بہت احترام کرتے تھے۔

مولوی صاحب کے الفاظ بہت میٹھے ہوتے تھے اور بچوں کے لیے ان کا برتاؤ بہت نرم اور دل پر اثر کرنے والا ہوتا تھا۔ بچے بھلے ہی کیسی بھی غلطی یا شرارت کریں لیکن کیا مجال کہ مولوی صاحب کے منہ سے ایک لفظ بھی تیز آواز میں نکلے، ان پر ہاتھ اٹھانے کی بات تو بہت دور تھی۔ بچوں کے استاد ہونے کی وجہ سے وہ سارے گاؤں کے بہت باعزت اور ہمدرد شخص بن گئے تھے۔ ویسے بھی ان کا گھرانا بہت اچھا تھا اور جب ان کے بیٹے کریم کا انتقال ہوا تو آدھے سے زیادہ گاؤں کے لوگ اس کے جنازے میں ساتھ گئے تھے۔

رفتہ رفتہ برسوں گزر گئے۔ اس بیچ مولوی صاحب کی بیوی کا بھی انتقال ہوگیا اور اپنے بیٹے کریم کے نزدیک ہی انھوں نے ایک چھوٹی سی یادگار فاطمہ بیگم کے لیے بھی بنوادی۔ کچھ اور برس اس طرح گزر گئے اور وقت کے ساتھ مولوی صاحب کے سر اور داڑھی مونچھ کے بال بھی سفید ہوگئے۔

ایک روز اچانک ملک میں فرقہ وارانہ فسادات کی آگ بھڑک اٹھی۔ چاروں طرف مار کاٹ اور لوٹ مار کے مناظر

دکھائے جانے لگے، ہر جگہ ڈر اور خوف چھا گیا۔ کل تک جو دوست تھے وہ دشمن بن گئے اور ایک دوسرے کی جان لینے کے درپے ہو گئے۔

شہروں کی آگ کی لپٹیں دیہاتوں میں بھی پہنچیں۔ مولوی صاحب نے دیکھا کہ ان کے گاؤں کا رخ بھی بدلتا جارہا ہے لیکن اس سے انھیں ذرا بھی فکر نہ ہوئی۔ وہ اپنے اسی پیار اور محبت سے بچوں کو پڑھاتے اور گاؤں والوں کے ساتھ پیش آتے رہے۔

ایک روز رات کو مولوی صاحب کھانے وغیرہ سے فارغ ہو کر چار پائی پر بیٹھے تھے کہ اچانک اس گاؤں کے مکھیا کا لڑکا آیا۔ مولوی صاحب نے بڑی نرمی سے اس سے پوچھا ''کیا بات ہے دیوی بیٹا!''

دیوی زور زور سے رونے لگا جس سے مولوی صاحب کچھ حیران اور پریشان ہو گئے۔ انھوں نے دیوی کو اپنی طرف کھینچ لیا اور اس کی پیٹھ تھپتھپاتے ہوئے بولے: ''بیٹا! اتنے دکھی ہونے کی کیا بات ہے؟''

دیر تک دیوی کی ہچکی نہیں رکی لیکن پھر وہ سنبھلا اور بولا: ''مولوی صاحب! آپ اس گاؤں سے چلے جائیے۔''

''کیوں بیٹے؟'' مولوی صاحب نے بغیر کسی گھبراہٹ کے پرسکون انداز میں کہا:

''میں آپ کے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں مولوی صاحب! آپ آج ہی چلے جائیے، میں آپ سے کیا کہوں؟'' اس نے رک رک کر اور خوف زدہ حالت میں آگے کہا: ''آج ہری، لیلا اور پنچم صلاح کر رہے تھے کہ...''

''کیا صلاح کر رہے تھے؟'' دیوی کے چپ ہو جانے پر مولوی صاحب نے پوچھا۔

دیوی پریشانی سے بولا ''کہتے تھے کہ ایک دن، رات کے وقت مولوی صاحب کے گھر دھاوا بول دو اور انھیں... ''

اس کے آگے دیوی کو کچھ بھی کہنے کی ضرورت نہیں تھی۔ مولوی صاحب سب کچھ سمجھ گئے تھے۔ ان کے بوڑھے چہرے پر ذرا سی بھی فکر ظاہر نہ ہوئی۔ انھوں نے ہنستے ہوئے کہا ''بیٹا! اس میں حیران ہونے کی کیا بات ہے؟''

انھوں نے اسے تسلی دی ''جاؤ بیٹے! تم آرام سے سو جاؤ، تمھارے مولوی صاحب کو ایک دن ویسے بھی... '' انھوں نے جان بوجھ کر جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

دیوی پھر بولا ''میں آپ کے پیر پڑتا ہوں مولوی صاحب! آپ چلے جائیے۔'' اس نے مولوی صاحب سے التجا کی ''ہم چھ لوگ کچھ دور ساتھ چلیں گے جس سے راستے میں کوئی بات نہ ہو۔''

دیوی نے بعد میں بھی بہت منتیں کیں لیکن مولوی صاحب جانے کے لیے راضی نہ ہوئے۔ انھوں نے صاف کہہ دیا ''مصیبت سے ڈر پوک لوگ ہی بھاگتے ہیں۔'' وہ آگے بولے: ''جس شخص کی زندگی کی عمارت پیار کی بنیاد پر کھڑی ہو، اسے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔''

دیوی ناامید واپس چلا گیا اور مولوی صاحب چار پائی پر لیٹ گئے۔ ان کے دل میں کسی طرح کا ڈر نہیں تھا لیکن کریم اور فاطمہ کی یاد سے انھیں تھوڑی بے چینی ضرور ہوگئی، وہ سوچنے لگے ''یہ سب کیا ہے؟ آدمی کے پیار کے پانی کا بلبلہ ہے جو ذرا سی دیر میں پھوٹ جاتا ہے؟ پیار کی جڑیں کیا اتنی کمزور ہوتی ہیں کہ ذرا سی ہوا لگے اور وہ اکھڑ جائیں؟ یا اللہ!''

کہانی

رات کو دیر تک مولوی صاحب حضرت محمد صاحب کی سوانح حیات پڑھتے رہے لیکن پچھلے پہر دروازے پر ہلکا سا کھٹکا ہوا، وہ چپ چاپ لیٹے رہے۔ آہٹ کی آواز آ کر کچھ خاموشی چھا گئی لیکن دو منٹ بعد ہی وہ دیکھتے کیا ہیں کہ بہت آہستگی سے دروازہ کھلا اور ایک کے بعد ایک تین لوگ اندر گھس آئے۔

چاند کی روشنی میں مولوی صاحب کو یہ پہچاننے میں دیر نہ لگی کہ آگے گردھاری ہے اور وہ آہستہ آہستہ قدم بڑھتا چلا آرہا ہے۔ مولوی صاحب جیسے لیٹے تھے اسی طرح خاموشی سے لیٹے رہے۔

گردھاری ان کی چارپائی سے کوئی دو گز کی دوری پر رک گیا۔ اس نے ادھر اُدھر، آگے پیچھے چوکنا ہوکر دیکھا اور اپنے ساتھی کو اشارہ کیا۔ اشارہ پاتے ہی ساتھی نے اسے کوئی چیز دی۔ گردھاری ایک قدم اور آگے بڑھا۔ مولوی صاحب نے دیکھا کہ اس کے دونوں ساتھیوں میں ایک لڑکا پنچم اور دوسرا لیلا ہے۔ ان تینوں لڑکوں کو انھوں نے پڑھایا تھا۔

گردھاری کچھ سوچتا ہوا دیر تک وہیں کھڑا رہا۔ وہ نہ آگے بڑھتا تھا اور نہ پیچھے ہٹتا تھا، بس ایک مورتی کی طرح خاموش کھڑا تھا۔ اسے اس پریشان حالت میں مولوی صاحب دیر تک نہ دیکھ سکے اور اور بڑے پیار سے نرم لہجے میں بولے:

''بیٹا گردھاری! کیا سوچ رہے ہو آگے کیوں نہیں بڑھتے؟''

یہ سن کر گردھاری بالکل سن کھڑا رہ گیا، 'کاٹو تو خون نہیں' والا محاورہ سچ ثابت ہو رہا تھا۔ مولوی صاحب کھاٹ سے اٹھ کر بیٹھ گئے اور بولے: ''بیٹا! آتے کیوں نہیں؟ تمھیں جو کچھ کرنا ہے وہ کرلو، میں تمھیں روکوں یا کچھ بھی کہوں تو اللہ مجھے دوزخ میں بھی جگہ نہ دے۔'' وہ اسی طرح دوسرے دونوں لڑکوں سے بھی مخاطب ہوکر بولے ''ارے پنچم اور لیلا! تم لوگ اتنی دور کیوں کھڑے ہو؟ آگے آؤ بیٹا اور گردھاری کی مدد کرو۔''

گردھاری اور اس کے دونوں ساتھی پریشانی سے خاموش کھڑے تھے۔ گردھاری سوچتا تھا: ''دھرتی پھٹ جائے تو وہ اس میں سما جائے۔ ہائے افسوس! اس نے یہ کیا کر ڈالا۔ اپنے پیارے مولوی صاحب کے ساتھ برائی کرنے کی بات سوچنے سے پہلے وہ مر کیوں نہیں گیا؟ اس کے خطرناک

ارادوں کے بدلے اس دیوتا کے منہ سے پیار بھرے الفاظ ہی نکل رہے ہیں۔ افسوس وہ کتنا برا ہے، کتنا پاپی!''

اب مولوی صاحب بہت پیار اور شفقت بھرے الفاظ میں بولے: ''گردھاری! مجھے تو وہ دن بھی یاد ہے جب تم میری گود میں کھیلے تھے اور میں نے اپنا بیٹا کریم مان کر پڑھایا تھا لیکن بیٹا! سچ کہتا ہوں مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ انسان کو اپنا فرض پورا کرنا چاہیے، میں نے جو کیا وہ میرا فرض تھا۔''

مولوی صاحب نے تینوں بچوں کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا ''میرے بچو! تم میرے پیارے ہو اور ایسا مان کر میرے دل سے تمھارے لیے صرف دعا ہی نکلے گی۔''

پورے چاند کی دودھ سی بکھری چاندنی میں مولوی صاحب کا چہرہ کچھ اور بھی چمک اٹھا تھا، یوں لگتا تھا جیسے وہ کوئی فرشتہ ہوں۔

گردھاری نے اپنے ہاتھ میں دبا ہتھیار ایک طرف کو پھینک دیا اور آگے بڑھ کر مولوی صاحب کے پیر پکڑ کر وہیں بیٹھ گیا۔ پنچم اور لیلا بھی خاموشی سے مولوی صاحب کی چارپائی کے پاس آ کر بیٹھ گئے۔ مولوی صاب نے ان دونوں کی پیٹھ تھپتھپائی اور دیکھا کہ ان کے قدموں کے پاس بیٹھا گردھاری بار بار اپنی آنکھیں پونچھ رہا ہے۔

■

Dr. Mod Athar Masood Khan
Ghaus Manzil, Talab Mulla Iram
Rampur - 244901 (UP)
Mob.: 9719316703

جوابات

شفیق الرحمن صدیقی

کہانی

تعلیم کا مقصد

ایک تعلیم یافتہ نوجوان تھا، اس کا نام آیان تھا، اس نے تعلیم حاصل کرنے کے بعد نوکری کی تلاش شروع کی، اشتہار دیکھ کر کئی جگہ اس نے درخواست بھیجی، کئی جگہ اس نے انٹرویو دیے لیکن اس کو نوکری نہ ملی تھی اور نہ ملی۔

نوکری نہیں ملنے کے سبب وہ کئی سالوں سے بے روزگار تھا اور گھر والوں کا دباؤ تھا کہ وہ جلد از جلد نوکری حاصل کرے، کب تک بے روزگار رہے گا۔

آخر وہ منفی سوچ کا شکار ہوگیا، سوچنے لگا ناحق اس نے تعلیم کے لیے اپنی زندگی کے بیش قیمت لمحات برباد کردیے، اس سے اچھا تھا محنت مزدوری کرتا تو آج یہ حالت نہ ہوتی۔ دربدر خاک نہیں چھاننی پڑتی اور نہ اس کی نوبت آتی۔

اس حالت میں گھومتا پھرتا وہ پولیس تھانے کے قریب پہنچ گیا۔ یکا یک اس نے دیکھا کہ ایک آدمی جس کے سر اور داڑھی کے بال شیو کی حد تک بڑھے ہوئے تھے، اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں لگی ہوئی تھیں۔ دو پولیس کے اہلکار اسے پکڑ کر چل رہے تھے اور آگے پیچھے پولیس کا سخت پہرا تھا۔

وہ چونک پڑا کیونکہ وہ کوئی اور نہیں اس کے بچپن کا کلاس فیلو ببلو تھا، جو پڑھائی سے ہمیشہ جی چراتا تھا اور جب اس کو کوئی ٹوکنے والا نہیں رہا تو اس نے پڑھائی چھوڑ دی اور آوارہ گردی کرنے لگا۔

لوگوں سے پوچھنے پر معلوم ہوا کہ وہ مشہور چور ہے، لوٹ مار کی درجنوں واردات میں واسطہ یا بالواسطہ ضرور ملوث ہے، آج اسے عدالت میں پیش کیا جارہا ہے۔ اس کو سخت سے سخت سزا ملے گی، اس کے خلاف پختہ ثبوت ہیں جو سزا دلوانے کے لیے کافی ہیں۔

یہ سن کر وہ سر سے پیر تک کانپ گیا، اس نے اپنے آپ کو نارمل رکھنے کی بے حد کوشش کی۔ جب اس کے ہوش و حواس بحال ہوئے تو تعلیم کے متعلق جو کچھ بے ہودہ خیالات دل میں آئے تھے ان پر سخت نادم ہوا۔

اسے یاد آیا، تعلیم کے ابتدائی دنوں میں ٹیچر ہمیشہ بتاتے

کہ تعلیم اس لیے حاصل کرنی چاہیے کہ اس سے اچھے خیالات اور اچھی سوچ پیدا ہوتی ہے، اچھے اور برے کاموں کے بارے میں جانکاری حاصل ہوتی ہے، محنت، لگن اور ایمانداری سے کام کرنے کا سبق ملتا ہے۔ ملک کی خدمت میں صرف نوکری پیشہ افراد ہی شریک نہیں بلکہ ہر وہ آدمی برابر کا حصہ دار ہے جو محنت، لگن اور ایمانداری سے کام کرتا ہے۔

پھر وہ بے خودی کے عالم میں بڑبڑانے لگا، نہیں میں نے تعلیم حاصل کر کے کچھ بھی غلط نہیں کیا۔ مجھے خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ اس نے مجھے تعلیم جیسی نعمت عطا کی جو زندگی کے ہر موڑ پر میری رہنمائی کا فریضہ انجام دیتی رہے گی۔

اگر مجھے نوکری نہیں ملی تو کیا ہوا، روزی روٹی کے ہزاروں ذرائع ہیں جن میں سے ایک نوکری تھی، میں دوسرا ذریعہ معاش اپنا کر پاک کمائی سے اپنے اور اپنے گھر والوں کا پیٹ بھروں گا۔ میں کبھی وہ کام نہیں کروں گا جو میرے ساتھی نے کیا تاکہ مجھے اور میرے گھر والوں کو ذلت اور رسوائی کا سامنا نہ کرنا پڑے، مجھے تعلیم نے یہی سکھایا ہے۔

یہ سوچتے ہی اس کی ساری مایوسی ختم ہوگئی پھر اس نے تجارت کرنے کا پختہ ارادہ کیا۔ سب سے پہلے اس نے محنت مزدوری کر کے کچھ رقم اکٹھا کی اور کباڑ خانے سے ایک پرانی سائیکل خریدی۔ اس کی مرمت کر کے استعمال کے قابل بنایا۔

پھر اس نے دوست کے توسط سے ایک کپڑا تاجر سے بات کی کہ اگر اسے آدھا نفع دیا جائے تو وہ کپڑوں کو فروخت کرانے میں اس کی مدد کرے گا۔

تاجر راضی ہوگیا، اس نے کپڑے کی ایک گٹھری لی اور گلیوں میں گھوم پھر کر فروخت کرنے لگا۔ چند روز میں اسے اتنا منافع ہوا کہ اس نے پیسے دے کر کپڑے کے کئی تھان خرید لیے اور ایک دوکان کرائے پر لے کر وہیں فروخت کرنے لگا۔

آیان بااخلاق ہونے کے ساتھ ہنس مکھ اور خوش مزاج تھا۔

اس کی دکان پر ہمیشہ بھیڑ لگی رہتی۔ اس کے گاہکوں میں نچلے طبقے کے غریب اور مزدور پیشہ افراد زیادہ تھے۔

کم نفع زیادہ بکری کو اس نے اپنا اصول بنایا، گاہک کے اشارے پر کپڑوں کے تھان کھول کر رکھ دیتا۔ گاہک کو کپڑا پسند نہیں ہونے پر بھی ناک بھوں نہیں چڑھاتا۔

یہی وجہ تھی کہ جو بھی گاہک ایک بار اس کی دکان پر آجاتا، وہ کبھی دوسری دکان کا رخ نہیں کرتا تھا۔ اب اس کا شمار شہر کے کامیاب تاجروں میں ہونے لگا تھا۔ اس نے اپنے ماں باپ کو حج بیت اللہ کرایا، کئی غریب لڑکیوں کی شادی کی، یتیموں، غریبوں، بے کسوں اور بے سہارا لوگوں کی مدد کی۔ اب وہ تاجر ہونے کے ساتھ شہر کا معزز سماجی کارکن بھی تھا۔

اس کی دیکھا دیکھی شہر کے دوسرے تاجر بھی بھلائی اور نیک کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے لگے۔

پیارے بچو! نوکری نہیں ملنے پر ہمیں بددل نہیں ہونا چاہیے اور ہمیشہ غلط کاموں سے بچنا چاہیے، محنت، لگن اور ایمانداری کو اپنا شعار بنانا چاہیے۔ ہمیں انشاء اللہ ضرور کامیابی ملے گی۔

■

Shafiqur Rahman Siddiqui
Mohalla: Bansa
Post: Kurthi Jafarpur- 275305
Distt: Mau (UP)

غلام محی الدین ترک

ایک دیا روشنی کا

ماسٹر جی نے عمارت دیکھی۔ یہ ایک اسکول تھا۔ انھوں نے نام پڑھنا شروع کیا۔ 'فیض علم ہائی اسکول'۔ ''یعنی ہم ٹھیک مقام پر پہنچ چکے ہیں۔'' انھوں نے دل میں سوچا۔

ماسٹر جی کا نام اخلاق احمد تھا۔ وہ ایک لمحہ اسکول کے پاس رکے اور بائیں طرف نظر دوڑائی۔ اسکول کے بالکل سامنے ایک کتھئی رنگ کی دومنزلہ عمارت تھی۔ وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے ہوئے اس عمارت کی طرف بڑھے۔ دروازے کے سیدھی طرف سنہری رنگ کی تختی لگی ہوئی تھی جس پر ظفر احمد خان لکھا ہوا تھا۔ ماسٹر جی نے آگے بڑھ کر دروازے پر دستک دی۔ دروازہ ایک نوعمر لڑکے نے کھولا۔

''السلام علیکم!'' ماسٹر صاحب نے اسے دیکھتے ہی کہا۔

''وعلیکم السلام!'' لڑکے نے جواب دیا۔

''منہال ظفر'' ماسٹر جی نے لڑکے کی طرف دیکھتے ہوئے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''جی جی اور آپ ماسٹر جی'' لڑکے نے زور دے کر کہا۔

ماسٹر جی نے ہاں میں سر ہلایا۔ اب منہال نے غور سے ماسٹر جی کو دیکھا۔ لمبا سا قد، گورا رنگ، سفید شلوار قمیض پر واسکٹ پہنے اور سر پر جناح کیپ سجائے ماسٹر جی اس کے دل میں گھر کر گئے۔ منہال انھیں گھر میں لے آیا اور انھیں ایک کمرے میں بٹھا دیا۔

''ماسٹر جی! میں سامنے والے اسکول میں پڑھتا ہوں۔ ہمارے ریاضی کے استاد صاحب دوسرے شہر چلے گئے ہیں۔

اسکول کے ہیڈ ماسٹر ہمیں روز تسلی دیتے ہیں کہ دوسرے استاد جی جلد ہی آجائیں گے مگر ایک ماہ ہو چکا ہے، ان کی جگہ اب تک کوئی بھی اُستاد نہیں آئے ہیں۔ اگلے ماہ بورڈ کے امتحانات ہونے والے ہیں اور ہماری تیاری بھی کچھ اچھی نہیں۔ اسی لیے میں نے جب اپنے خالہ زاد بھائی مبشر کو یہ بات بتائی تو اس نے کہا کہ فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں، ہمارے ماسٹر جی بہت اچھے ہیں، میں انھیں کہہ دیتا ہوں، وہ ضرور پڑھا دیں گے۔'' منہال ایک ہی سانس میں ساری باتیں کہتا چلا گیا۔

''ہاں بھئی، مبشر نے ہمیں سب کچھ بتا دیا ہے۔ اب طلبہ کو بلوا لیجیے تا کہ پڑھائی شروع کی جا سکے۔'' ماسٹر جی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''ماسٹر جی! کیا ابھی سے پڑھائیں گے۔ کیا بہتر نہ ہوگا کہ ہم کل سے پڑھائی شروع کریں۔'' منہال نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

''اچھے بچے آج کا کام کل پر نہیں ٹالتے اور علم سے پیار کرنے والے تو ہرگز ایسا نہیں کرتے۔'' ماسٹر جی جواب دیتے ہوئے مسکرائے۔

منہال یہ سن کر شرمندہ ہوا اور چٹکی بجاتے ہوئے بولا: ''اچھا تو ماسٹر جی! میں ابھی طالب علموں کو بلا کر لاتا ہوں۔ بس یوں گیا اور یوں آیا۔''

منہال کے جانے کے فوراً بعد طالب علم آنا شروع ہو گئے تھے۔ ہر طالب علم ماسٹر جی کو سلام کر کے اپنی جگہ بیٹھ جاتا۔ تھوڑی ہی دیر میں کمرہ طلبہ سے بھر چکا تھا۔ منہال بھی واپس آگیا، اس نے طالب علم گنے اور بولا: ''ماسٹر جی! سارے طالب علم آچکے ہیں۔''

''اچھا بھئی! ہم اپنی پڑھائی کا آغاز کرتے ہیں۔ یاد رکھیے، وقت کم ہے اور محنت سخت، زندگی کے میدان میں وہی بچے آگے بڑھتے ہیں، جو وقت کی قدر کرتے ہیں اور خوب محنت کرتے ہیں۔'' ان باتوں کے بعد ماسٹر جی نے پڑھانا شروع کر دیا تھا۔ ماسٹر جی بچوں کو بڑے پیار سے اس طرح سمجھا رہے تھے کہ ریاضی کے مشکل تصورات بھی بچوں کو آسان لگ رہے تھے۔

پڑھاتے پڑھاتے بچوں کو ایک گھنٹہ گزر گیا تو ماسٹر جی نے اپنی جیب سے بادام نکالے۔

''لو بھئی بچو! یہ بادام کھاؤ۔ ہم نے تو بزرگوں سے سنا ہے کہ بادام بڑے فائدہ مند ہوتے ہیں۔ ذہن کو طاقت دیتے ہیں۔ ریاضی پڑھنے والے بچوں کو تو خوب بادام کھانے چاہئیں مگر خیال رہے کہ ہر بچہ سات سے زیادہ بادام نہ کھائے۔'' ماسٹر جی نے بادام منہال کو دیے اور اس نے سارے بچوں میں بادام بانٹنا شروع کر دیے۔

کچھ دیر اور گزری تو ماسٹر جی نے بچوں سے اجازت لی، جاتے جاتے بولے: ''دوبارہ پڑھنا سبق کے لیے مفید رہتا ہے۔ اس سبق کو گھر پر بھی دہرائیے اور کل وقت پر آجائیے۔'' یہ کہہ کر وہ چلے گئے۔

اگلے دن ماسٹر جی وقت سے کچھ پہلے منہال کے گھر آگئے تھے۔ پڑھاتے پڑھاتے جب کافی دیر ہو گئی تو دروازے پر کسی نے آواز لگائی۔

''ماسٹر جی!''

''آجائیے۔'' ماسٹر جی نے باآواز بلند جواب دیا۔

آواز سنتے ہی فضلو اندر آگیا۔ وہ اسکول کے پاس ہی

ایک جوس والے کی دکان پر کام کرتا تھا۔ وہ ایک ہاتھ میں جگ اور دوسرے میں گلاس تھامے ہوئے تھا۔ جگ میں گاجر کا جوس تھا۔ بچے سمجھ گئے کہ کلاس شروع ہونے سے پہلے ہی ماسٹر جی نے گاجر کا جوس لانے کی ہدایت کردی ہوگی۔

’’گاجر کا رس بینائی تیز کرتا ہے۔ اسے پینے سے توانائی بھی آتی ہے اور پڑھنے میں بھی مزہ آتا ہے۔‘‘ ماسٹر جی مسکراتے ہوئے بولے۔ ان کی بات سن کر سارے بچے بھی مسکرا دیے تھے۔ جگ میں گاجر کا جوس ختم ہوا تو فضلو دوبارہ اسے بھر لایا۔

اب تو روز ہی ایسا ہونے لگا۔ فضلو روز ہی کسی نہ کسی پھل کا جوس لے آتا۔ کبھی سیب تو کبھی ناریل اور کبھی کینو۔ ماسٹر جی ساتھ ہی ان کے فائدے بھی بتا دیتے: ’’ارے بھئی، سیب کھانے والے اور اس کا جوس پینے والے بچے ڈاکٹر سے دور رہتے ہیں۔ یہ ہم ہی نہیں، ڈاکٹر بھی یہی کہتے ہیں۔ ناریل اور کینو میں وٹامن سی ہوتے ہیں۔ یہ دونوں آپ کو بیماریوں سے بھی بچاتے ہیں۔‘‘

فضلو بھی ماسٹر جی سے مانوس ہوگیا تھا۔ اسے ان کی باتیں سننے میں بڑا مزہ آتا۔ اس کے پاس کبھی وقت ہوتا تو جماعت ہی میں بیٹھ جاتا۔ ایک دن وہ بولا: ’’ماسٹر جی! میں پھلوں کے فائدے دکان پر آنے والے گاہکوں کو بھی بتاتا ہوں۔‘‘ یہ سن کر ماسٹر جی خوش ہوکر بولے: ’’اچھی باتیں بتانا بھی نیکی ہے۔‘‘

دن گزرتے رہے، بچوں کو پڑھنے میں خوب مزہ آرہا تھا۔ ایک ماہ میں ماسٹر جی نے ریاضی کی ساری کتاب کی تیاری

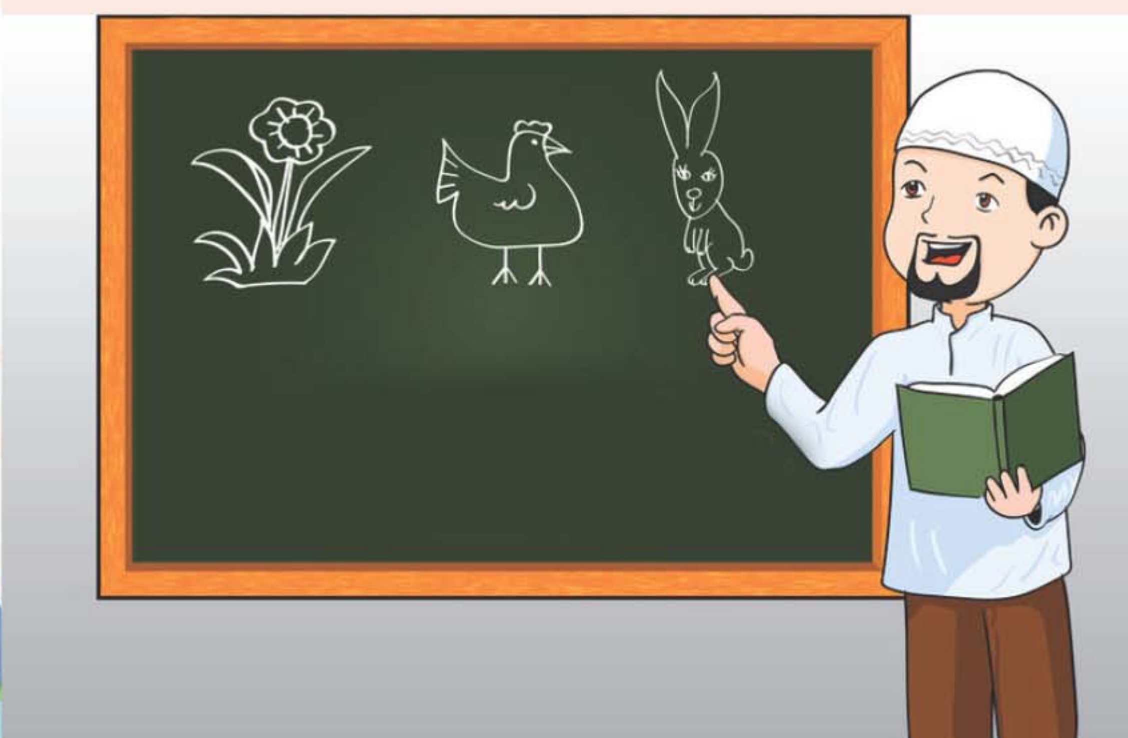

اس طرح کروادی تھی جیسے گھول کر پلادی ہو۔ایک ماہ پہلے بچے جس مضمون کی وجہ سے پریشان تھے، اب اس کے لیے بے فکر ہوگئے تھے۔

ایک دن ماسٹر جی آئے اور بولے:''کل ہماری کلاس کا آخری دن ہوگا۔آپ لوگوں کی تیاری مکمل ہوچکی ہے۔اگر کسی کو کوئی سوال سمجھنا ہوتو دیکھ لیجیے۔آپ کے پاس پورا دن ہے۔''

''ماسٹر جی!ہمارا جی چاہتا ہے کہ آپ روز آتے رہیں۔'' منہال نے معصومیت سے کہا۔

''بیٹا!مبشر سے کیا ہوا وعدہ ہم نبھا چکے ہیں۔ہم نے اپنا فرض ادا کردیا ہے، اب آپ بھی خوب پڑھ لکھ کر اپنا فرض ادا کریں۔اپنے دین اور وطن کی خدمت کریں۔''

اگلے دن ماسٹر جی آتے ہی بولے:''آج دل اداس ہے۔ہمارا بھی جانے کو جی نہیں چاہتا مگر کیا کریں۔مجبور ہیں۔ہم گاؤں کے رہنے والے ہیں۔ہمارے امی ابو بھی گاؤں میں رہتے ہیں۔انھوں نے ہمیں حکم دیا ہے کہ فوراً گاؤں چلے آئیں۔آپ لوگوں کی خاطر ہم نے چند دنوں کی اجازت لی تھی۔اب یہ چند دن پورے ہوچکے ہیں۔اگر کوئی سوال سمجھنا ہوتو بتایئے ورنہ ہم یہاں سے سیدھے ریلوے اسٹیشن چلے جاتے ہیں۔''

ماسٹر جی کی بات سن کر سارے بچوں نے ایک دوسرے کے چہروں کی طرف دیکھا۔چند بچوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں منہال کو اشارہ کیا تو وہ بولا:''ماسٹر جی!آپ نے فیس تو بتائی ہی نہیں اور ہم بھی اس بات پر شرمندہ ہیں کہ اب تک فیس کے بارے میں پوچھا ہی نہیں۔''

''ارے بھئی!کیوں ہمیں اپنی نظروں میں شرمندہ کر رہے ہو۔اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔فیس لے کر کیا کریں گے۔آپ پڑھ لکھ کر الخوارزمی، یعقوب الکندی اور ابونصر فارابی کی طرح ریاضی میں مسلمانوں کا نام روشن کریں۔دوسروں کے کام آئیں۔سب کی خدمت کریں۔یہی ہمارے پیارے نبیؐ نے بھی سکھایا ہے۔'' ماسٹر جی بولے۔ان کی باتیں سن کر بچوں کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔

''ارے، رو کیوں رہے ہو، دیکھو تمھارے لیے کینو کا جوس بھی آگیا ہے۔بچوں نے دیکھا فضلو جگ تھامے اندر آرہا تھا۔اس دن ماسٹر جی نے بچوں کو کینو کا جوس خوب پلایا۔

جب کافی دیر گزر گئی تو ماسٹر جی بولے:''اچھا بھئی، اب ہمیں اجازت دیجیے۔'' ماسٹر جی کے رخصت ہوتے وقت بچوں کی آنکھوں میں آنسو تھے۔بچے کافی دیر تک کمرے میں اسی طرح بیٹھے رہے اور اس وقت چونکے جب فضلو کی آواز سنائی دی۔

''ماسٹر جی کہاں ہیں؟''اس نے کمرے میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''وہ تو گھر جاچکے ہیں۔''منہال نے جواب دیا۔

''اچھا، کوئی بات نہیں، انھیں یاد نہیں رہا ہوگا۔میں ان سے کل پیسے لے لوں گا۔'' یہ کہہ کر وہ تیزی سے باہر نکل گیا۔

''کیا ماسٹر جی نے پیسے نہیں دیے ہیں۔''تنویر نے حیرانی سے کہا۔سارے بچے حیران تھے کہ ماسٹر جی پیسے ادا کیے بغیر گاؤں کیسے جاسکتے ہیں؟''

''آؤ، ہم پوچھتے ہیں۔کیا معاملہ ہے؟'' کاشف نے رائے دی۔

یہ کہہ کر سارے بچے باہر نکل گئے۔ باہر نکلتے ہی انھیں ایک عجیب تماشہ نظر آیا۔ جوس کی دکان کا مالک فضلو پر برس رہا تھا۔

''ارے نکمے، کبھی کام پر بھی دھیان دے لیا کر، اس ماسٹر جی نے آج پورے دو ہزار کا جوس لیا ہے، اتنے پیسے کہاں سے آئیں گے، کل تک کون صبر کرے گا، کیا کل تک بھوکے رہیں گے۔ یہ پیسے کون دے گا؟ میرا نقصان کون بھرے گا؟'' فضلو خاموشی سے اس کی باتیں سن رہا تھا۔

''ماسٹر جی تو اب کبھی نہیں آئیں گے۔ وہ ریلوے اسٹیشن گئے ہیں۔ وہاں سے اپنے گاؤں جائیں گے۔'' منہال نے کہا تو جوس والے کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔

''فضلو! اب تو تمھاری تنخواہ سے پیسے کٹیں گے۔ ماسٹر بنا پھرتا ہے۔ اچھی اچھی باتیں بتاتا ہے اور پیسے دیے بغیر ہی چلا گیا۔'' جوس والا سخت غصے میں تھا۔

''ماسٹر جی کو کچھ نہ کہیں۔ وہ تو بہت اچھے ہیں۔ تمھارے پیسے ہم سب دیں گے۔'' تنویر بول اٹھا۔ سب بچوں نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔ ابھی بچوں نے پیسے لانے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ ایک رکشا جوس والے کے پاس آ کر رکا۔ رکشے میں ماسٹر جی بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ رکشے سے اتر کر سیدھے جوس والے کی طرف بڑھے۔

''بھائی صاحب! معاف کیجیے گا، ہمیں یاد ہی نہ رہا کہ آپ کے پیسے دینے ہیں۔ ہم تو ٹرین میں بیٹھ بھی گئے تھے، جب ٹرین چل پڑی تو یاد آیا۔ ٹرین کی سیٹی دبا کر ٹرین رکوایا اور بڑی مشکل سے ٹرین والوں کو سمجھایا مگر وہ بھی جرمانہ لے کر ٹلے۔ غلطی بھی ہماری تھی، تو جرمانہ بھی ہمیں ہی ادا کرنا تھا ورنہ ہمارے ملک کا نقصان ہو جاتا۔ اب بتایئے آپ کے کتنے پیسے ہوئے؟''

جوس والا حیرانی سے کبھی ماسٹر جی کو، کبھی فضلو کو اور کبھی بچوں کو دیکھنے لگا۔ ماسٹر جی اسے کسی اور ہی دنیا کے باسی لگ رہے تھے۔ فضلو بے اختیار ماسٹر جی سے لپٹ کر رونے لگا تھا۔ ماسٹر جی حیرانی سے اس کے رونے کی وجہ پوچھ رہے تھے۔ ''کاش میرے پاس پیسے ہوتے کہ میں جوس کی قیمت ادا کر دیتا۔'' فضلو نے روتے ہوئے کہا۔ منہال نے ماسٹر جی کو حقیقت بتائی۔

''ارے کوئی بات نہیں، غلطی میری ہی تھی جو پیسے ادا کیے بغیر ہی وہاں سے چلا گیا تھا۔ اور بچو! پیسے لینا جوس والے کا حق تھا۔ ایک مومن کے لیے یہ بات اچھی نہیں کہ وہ کسی کا مال کھا جائے۔ زندگی کا کیا بھروسا۔ ہم ناحق کسی کے پیسے کیوں دبائیں۔ ہمارے نبیؐ نے بھی ایسا کرنے سے منع کیا ہے۔''

پھل والے کے پیسے ماسٹر جی کے پاس امانت تھے اور وہ جرمانہ ادا کر کے بھی یہ امانت لوٹانے آئے تھے۔ امانت لوٹانا بھی نبی پاکؐ نے سکھایا ہے۔ ماسٹر جی کو واپس جاتا دیکھ کر فضلو، بچوں کے ساتھ ساتھ اب جوس والے کی آنکھوں میں بھی آنسو تھے۔ ماسٹر جی روشنی کا دیا تھے اور یہ خوبیاں انھوں نے پیارے نبیؐ کی سیرت سے سیکھی تھیں۔

■

Ghulam Mohiuddin Turk
1727/657, Turk Colony
Gali No 2, Baldia Town
Karachi (Pakistan)

فیروز عابد

تین لفافے

مولوی مصطفیٰ خان صاحب ہمیں حساب اور سائنس پڑھاتے ہیں۔

وہ پستہ قد کے نہایت گورے، صحت مند، خوبصورت اور بارعب استاد تھے، نہایت پرہیزگار، ایماندار، محنتی اور اپنے شاگردوں سے محبت کرنے والے۔

وہ وقت سے پہلے اسکول آجاتے۔قومی ترانہ اور دعا کے بعد پانچویں جماعت میں چلے جاتے۔ وہ بچوں کو نہ مارتے تھے اور نہ ڈانٹ ڈپٹ کرتے تھے۔ جو طالب علم بلیک بورڈ پر صحیح حساب نہیں بنا پاتے۔ وہ انھیں اسکول کی چھٹی کے بعد گھر جانے کی اجازت نہیں دیتے۔ وہ اپنے بیٹے مجتبیٰ خان اور ان طلبہ کے ساتھ پہلی منزل کے کلاس روم میں بیٹھ جاتے اور انھیں حساب کی مشق کراتے۔ اس زمانے میں اسکول میں بجلی نہیں تھی۔ وہ موم بتی کی روشنی میں پڑھاتے تھے۔ وہ اپنے بیٹے مجتبیٰ خان کے ناشتے سے بچوں کو بسکٹ کھلاتے۔ کبھی کبھی مغرب کی نماز پڑھ کر ان کی کاپی جانچتے اور انھیں والدین کے ساتھ گھر جانے کی اجازت دیتے۔

ہمارا اسکول مڈل انگلش اسکول تھا۔ یہاں درجہ ششم تک ہی پڑھائی ہوتی تھی۔ یہ اسکول خالص سرکاری اسکول تھا اور ہر سال یہاں سے کم سے کم تین طالب علم ایم ای اسکالرشپ کا امتحان دینے کسی اور اسکول میں جاتے تھے۔ ہم جب درجہ سوئم کے طالب علم تھے تو ہمارے، ہم جماعت اقبال خان کے بڑے بھائی قیصر خان درجہ ششم میں تھے۔ اسی سال قیصر خان اور ان کے ہم جماعت محمد عمر اور محمد انور کو اسکول نے ایم ای اسکالرشپ امتحان کے لیے منتخب کیا۔ امتحان کے تقریباً تین ماہ باقی تھے۔ مولوی مصطفیٰ خان صاحب نے انھیں دل لگا کر پڑھنے کا مشورہ دیا۔ کامیاب ہونے پر درجہ دہم تک ان کی تعلیم مفت ہوگی اور حکومت کی طرف سے پانچ روپے ماہانہ اسکالرشپ کے بھی ملیں گے۔

وہ لوگ ضرورت محسوس کریں تو چھٹی کے بعد ان کے ساتھ بیٹھ جائیں۔ وہ انھیں پڑھا دیا کریں گے اس کے لیے وہ

پانچ روپے ماہانہ ٹیوشن فیس لیں گے۔

ٹیوشن فیس کی بات جب میرے ہم جماعت اقبال خان کومعلوم ہوئی تو اسے ان کا اس طرح ٹیوشن مانگنا برا لگا۔

قیصر خان، محمد عمر اور محمد انور کے والدین ٹیوشن پڑھوانے کے لیے راضی ہوگئے۔ استاد کی محنت ان تینوں کی لگن اور محنت رنگ لگائی۔ تینوں نے ایم ای اسکالرشپ کا امتحان امتیازی نمبروں کے ساتھ پاس کرلیا۔ مولوی مصطفیٰ صاحب بہت خوش ہوئے، دعائیں دیں اور پھر تینوں ہونہار شاگردوں کو بلا کر ان کے ہاتھوں میں ایک ایک لفافہ دے دیا۔ تینوں نے ایک ساتھ پوچھا ''سر یہ کیا ہے؟'' تب ہی مولوی مصطفیٰ خان صاحب نے مسکراتے ہوئے انھیں بتایا کہ ان لفافوں میں وہی روپے ہیں جو ان لوگوں نے انھیں فیس کے طور پر دیے تھے۔ یہ لفافہ آپ لوگوں کا انعام ہے۔ آپ اپنے والدین کو دے دیں۔ اسکول سے مجھے اچھی تنخواہ ملتی ہے۔ میں فیس لے کر ٹیوشن نہیں پڑھاتا۔ آپ لوگ محنت سے امتحان کی تیاری کریں اور آپ کے والدین بھی آپ کی فکر کریں اسی لیے میں نے یہ کی شرط لگائی تھی۔ اللہ آپ لوگوں کو مزید ترقی دے۔ آپ لوگ اعلیٰ تعلیم حاصل کریں اور اعلیٰ مقام حاصل کریں۔

مولوی مصطفیٰ صاحب کب کے دنیا سے رخصت ہوگئے۔ اس واقعے کو 65 سال بیت گئے۔ اقبال خان کو آج بھی اپنی نادانی کا احساس ہے۔ وہ اکثر گفتگو کرتے کرتے غمگین ہوجاتا ہے اور مولوی مصطفیٰ خاں مرحوم کا ذکر ایک بہترین معلم کی حیثیت سے کرتا ہے اور آج کے تعلیمی نظام پر افسوس کرتا ہے اور کہتا ہے ''کہاں گئے ایسے استاد!''

■

Firoz Abid
Baitul Qasim
12/3-H/1, Patwar Bagan Lane
Kolkata - 700009 (West Bengal)

پرویز احمد

کہانی

زخم دل

ابو کے سامنے بیٹھا نواز اب مطمئن سا تھا۔تھوڑی دیر پہلے اس کے ابو اسے سمجھا رہے تھے کہ اپنی محبت یا نفرت کے اظہار سے کسی پر کیا گزرتی ہے۔ہمیں اس کا احساس ہونا چاہیے۔نفرت کا لفظ کسی پتھر کی طرح ہوتا ہے اور یہ جس کے لیے بھی کہا جاتا ہے اسے زخمی کر دیتا ہے،اس کی ہمت اور طاقت ختم کر دیتا ہے بلکہ دوسروں کے دلوں میں آپ کے لیے محبت ختم ہونے لگتی ہے۔پہلے ادب واحترام ختم ہوتا ہے پھر اس کی جگہ نفرت لینے لگتی ہے،رشتوں میں دراڑیں پڑنے لگتی ہیں پھر وہ ٹوٹنے لگتے ہیں اور ٹوٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتے ہیں۔

دوسرے بچوں کی طرح نواز بھی بچپن سے والدین کی شفقت و محبت کے سائے میں اپنی مرضی کی زندگی گزار رہا تھا،غرور اور تکبر اس کے مزاج میں تھا۔وہ کسی بھی چیز کو پسند اور ناپسند کرنے میں اپنی مرضی کا مالک تھا۔چیزوں سے اپنی محبت اور نفرت کا اظہار بلا جھجک کر دیا کرتا تھا۔

صبح کے سات بجے جب امی نواز کو جگانے کے لیے کئی بار آتی تو اسے پیار سے پچکارتی،سہلاتی اور اسکول کے لیے لیٹ ہو جانے کی فکر بھی ظاہر کرتی۔مگر نواز پر کوئی اثر نہیں ہوتا بلکہ وہ کروٹ بدل کر پھر سو جاتا۔بار بار جگانے کی وجہ سے غصہ کے لہجہ میں کہتا مجھے جلدی اٹھنے سے نفرت ہے اور اسی وجہ سے اسکول جانے سے بھی نفرت ہے۔یہ تو روزانہ کا معمول تھا۔

سمیر،نواز کے اچھے دوستوں میں سے تھا اور غریب تھا۔اس کی سالگرہ پر اس کے والد نے اسے اسکول بیگ تحفہ میں دیا۔کلاس میں داخل ہوتے ہی سمیر نے بڑے شوق سے نواز کو

اپنا بیگ دکھایا مگر نواز کو اس بیگ کا رنگ پسند نہ آیا اور پوری طرح دیکھے بغیر کہہ دیا کہ مجھے تو تمھارے اسکول بیگ کا رنگ ہی پسند نہیں مجھے تو اس رنگ سے ہی نفرت ہے۔ سمیر جو رات سے بہت خوش تھا کہ صبح اسکول جا کر سب سے پہلے نواز کو اپنا بیگ دکھائے گا۔ وہ نواز کی بات سن کر ایک دم ٹوٹ سا گیا اور خاموش ہو گیا، پھر سارا دن اداس ہی رہا کسی سے کوئی بات کرنے کا دل ہی نہ ہوا۔ لیکن نواز کو اس بات کی قطعی پرواہ نہیں ہوتی کہ اس کی نفرت کے اظہار سے دل پر کیا گزری۔ نوید کے چاچا دبئی سے اس کے لیے ایک اسپورٹس واچ لے کر آئے جسے اسکول میں سب دوستوں نے بہت پسند کیا، تعریفیں کیں مگر جب نواز کو دکھایا تو اس نے فوراً اپنی آزاد خیالی کا اظہار کیا اور کہا کہ ہم نے بہت دیکھی ایسی گھڑی مجھے تو یہ بالکل پسند نہیں آئی۔ نوید جو صبح سے اپنی گھڑی کی تعریفیں سن کر خوش ہو رہا تھا، نواز کے ایک جملے سے ہی اس کا دل ٹوٹ گیا اور اسے نواز کی بات بہت بری لگی۔

شام کو اکثر کھانے کے لیے دستر خوان سجایا جاتا اور تمام افراد ایک ساتھ جمع ہوتے لیکن نواز عادتاً کھانے میں کمیاں نکالتا اور اپنی ناپسندیدگی اور نفرت کا اظہار کر دیتا اور دستر خوان سے اٹھ جاتا پھر امی اس کے لیے آملیٹ بنا کر اس کی میزبانی میں مصروف ہو جاتی۔ گھر میں سب سے چھوٹا ہونے کے سبب کوئی بھی اس کا برا نہیں مانتا۔ کوئی پھل ہو یا مٹھائی اگر اسے پسند نہ ہو تو اس کا اظہار بلا جھجک کر دیتا۔ اس کی یہ عادت اس کا تکیہ کلام بن چکی تھی۔ رشتہ داروں کے یہاں دعوت میں بھی اس کا یہی رویہ رہتا جس سے اکثر ناراضگی کا سامنا کرنا پڑتا۔

غرض کہ زندگی کے دن گزرتے رہے۔ نواز اور سمیر اسکول و کالج کی تعلیم سے فارغ ہو کر نوکری کی تلاش میں لگ گئے۔ اتفاق سے دونوں کو نوکری بھی ایک ہی کمپنی کے ایک ہی ڈپارٹمنٹ میں ملی۔ اس لیے دونوں بہت خوش تھے۔ بچپن، اسکول و کالج کا ساتھ تھا ان کا، اب نوکری بھی ایک ساتھ۔ گھر کے تمام لوگ بھی بہت خوش تھے۔ کچھ عرصے بعد لوگ محسوس کر رہے تھے کہ نوکری میں سمیر جتنا خوش و مطمئن تھا نواز مطمئن نہیں نظر آتا۔ گھر آ کے بھی وہ سب سے الجھا الجھا رہتا۔ ابو بھی یہ بات کئی دنوں سے محسوس کر رہے تھے۔ ایک دن پوچھ ہی لیا۔

بیٹے کیا بات ہے؟ پریشان ہو؟

اتنی اچھی نوکری پانے کے بعد بھی تم خوش نظر نہیں آتے۔

ہر وقت خاموش سے رہنے لگے ہو۔

پہلے تو نواز نے ابو کی جانب بے چارگی سے دیکھا۔ پھر نظریں نیچی کر کے کہنے لگا۔

ابو میں یہ نوکری نہیں کرنا چاہتا۔

مجھے اس سے نفرت ہے۔

سب جانتے تھے کہ یہ ایک اچھی نوکری ہے۔ اچھی تنخواہ کے علاوہ دیگر رعایات بھی شامل تھیں۔ پھر نواز کو کیا پریشانی تھی۔ پہلے تو ابو نے اسے پیار سے سمجھانے کی کوشش کی پھر اس سے نوکری سے بددل ہونے کی وجہ پوچھی تو نواز نے کہا۔

'میں ڈپارٹمنٹ میں محنت اور لگن سے کام کرتا ہوں اور کوشش کرتا ہوں کہ کام میں کسی بھی طرح کی کوئی کمی یا نقص نہ رہ جائے مگر میرے ڈپارٹمنٹ میں جو سینئر افسر ہیں انہیں میرا کام پسند ہی نہیں آتا۔ ہر کام میں نقص ہی نکالتے ہیں، دن میں

1

کئی بار مجھے ان کے سامنے شرمندہ ہونا پڑتا ہے۔ میں جب بھی کوئی کام کرتا ہوں اور اس کی فائل افسر کو دکھاتا ہوں تو وہ کہتے ہیں کہ:

کام اس طرح کرتے ہیں؟

اس طرح کے کام کرنے والوں سے مجھے سخت نفرت ہے۔

حالانکہ سمیر اور میرے کام کے طریقہ کار میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہوتا۔ مگر سمیر کے ساتھ کسی کا بھی رویہ اس طرح کا نہیں ہوتا ہے۔

میں آہستہ آہستہ خود کو ناقابل محسوس کرنے لگا ہوں۔ مجھے اب اپنی قابلیت پر بھروسہ نہیں رہا۔ میں نے سوچا ہے کہ یہ نوکری چھوڑ دوں گا۔

ابو نے غور سے ساری باتیں سنیں، پھر نواز کی طرف دیکھ کر کہا کہ بیٹا تم تو نوکری چھوڑنے کی بجائے کچھ اور چھوڑ دو تمھارے حالات درست ہو سکتے ہیں۔ نواز نے ایک دم چونک کر ابو کی طرف دیکھا اور سوچنے لگا کہ ایسا کیا ہے اس کے پاس جس کے چھوڑ دینے سے حالات درست ہو سکتے ہیں۔ ابو نے شفقت سے نواز کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا کہ بیٹا! تم بچپن سے سب کی شفقت اور محبت کے سائے میں پلے بڑھے ہو۔ اپنی مرضی کی زندگی بسر کرتے آئے ہو۔ اپنی پسند اور ناپسند کے خود مالک ہو۔ اپنی نفرت یا محبت کا اظہار بلا جھجک کر دیتے ہو۔ اس کا اثر دوسروں پر کیا ہوتا ہے اس کا احساس اور پرواہ بھی نہیں کرتے۔ ہمیں دوسروں کے بجائے اپنے برتاؤ پر غور کرنا چاہیے کہیں ایسا تو نہیں کہ غلطی ہماری ہو۔

نواز اپنے ابو کا ایک ایک جملہ غور سے سن رہا تھا۔ اسے یاد آیا کہ کل جب وہ فائل لے کر اپنے افسر کے پاس گیا اور انھیں کام کی تفصیل بتانے لگا تو انھوں نے سرخ رنگ کی پنسل سے فائل پر بڑے بڑے دائرے کھینچ دیے۔ یہ ایسے نہیں ایسے ہونا چاہیے، وہ ایسے نہیں ایسے ہونا چاہیے۔ آخر میں انھوں نے کہا کہ انھیں اس طرح کا کام پسند نہیں بلکہ ایسے لوگوں سے نفرت ہے جو اپنا کام ڈھنگ سے نہیں کرتے۔

اب نواز کو احساس ہونے لگا کہ وہ بھی تو بچپن سے دوسروں کے دل ایسے ہی توڑتا آیا ہے کبھی ایک لمحہ کے لیے بھی نہیں سوچا کہ کسی کے دل پر کیا گزرتی ہوگی، پتہ نہیں کتنے لوگ اس سے بد دل ہوئے ہوں گے، کتنے دل ٹوٹے ہوں گے۔ اب اسے لگ رہا تھا کہ اس کے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے اس کا ذمہ دار وہ خود ہے۔ افسر کے برتاؤ کے باعث اس کی جرأت و ہمت، شوخی و شرارت سب ختم ہو کر رہ گئی تھی۔

نواز نے اپنے ابو کی طرف دیکھا جیسے پوچھ رہا ہو کہ اب کیا کرنا چاہیے۔ ابو نے اس کی نگاہوں کا مطلب سمجھتے ہوئے کہا کہ گناہ اور غلطی کا احساس ہونے پر اسے چھوڑنے کی کوشش کرنی چاہیے اور واپسی کا راستہ موجود ہو تو پلٹنے میں دیر نہیں کرنی چاہیے۔ نواز کے اندر کچھ دنوں سے جو الجھن اور اس کی تلخی بھر گئی تھی وہ اب آہستہ آہستہ اس کے وجود سے الگ ہو رہی تھی۔ نفرت اور ناپسند کا لفظ دور جاتا محسوس ہو رہا تھا۔ اس کے اندر کا احساس کیا بدلا سب کچھ بدل سا گیا تھا۔

■

Parvez Ahmed
Yaqub Pahalwan House
Peeli Haveli Chowk, Kamptee
Nagpur 441001 (Maharashtra)

حشمت کمال پاشا

کہانی

پانڈا

سنیچر کی رات تھی۔تقریباً نو بج رہے تھے۔میں کھانا کھا چکا تھا۔دوسرے ابھی تک کھا رہے تھے۔ممی سبھوں کو کھلا رہی تھیں۔ پروفیسر حمید چچا صوفے پر بیٹھے چائے کی چسکی لے رہے تھے اور ساتھ ہی ممی سے باتیں بھی کیے جا رہے تھے کہ میں نے دخل اندازی کی۔ چچا جان! چچا جان! آج کا اخبار آپ نے دیکھا!

ہاں دیکھا! کیوں؟ چچا نے جواب دیا۔

ایشیائی کھیل۔آج سے شروع ہو رہا ہے۔مگر.....

''مگر'' کیا۔؟''

لیکن اس بار ایشائی کھیل کے اشتہار میں ایسی تصویر ہے جس کا ''سر'' بھالو کا ہے اور باقی جسم بچے کا۔میں ایک سانس میں کہہ گیا۔

ہاں! ہاں میں نے بھی صبح اخبار میں یہ اشتہار دیکھا ہے۔میری بھی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ آخر یہ کیا ہے؟ ممی نے کہا۔

چچا جان زور سے ہنسے اور بولے اچھا! اچھا! بچوں کو کھانا کھا لینے دیجیے۔پھر بتاتا ہوں کہ یہ کیا ہے؟

''پروفیسر چچا صوفے پر تھے۔ممی اسٹول کھینچ کر ان کے قریب بیٹھ گئیں اور ہم سب ان کے اردگرد جمع ہو گئے۔

پروفیسر چچا نے پائیپ کا ایک لمبا کش لے کر کہانی یوں شروع کی۔ یہ تو تم سبھوں کو یاد ہوگا کہ جس ملک میں ایشیائی کھیل ہوتا ہے۔ وہ ملک اپنے ملک کے پس منظر میں ایشیائی کھیلوں کا Mascot یعنی Syambol یا نیک علامت بنواتا ہے۔ 1952 میں ہمارے ملک بھارت میں ایشیائی کھیل کا Mascot یعنی سمبل ''اپو'' بنایا گیا تھا۔لیکن یہ جان لو کہ کسی بھی ملک کا Mascot بنانا کوئی آسان کام نہیں بلکہ اس میں بڑی

سوجھ بوجھ کی ضرورت ہوتی ہے چونکہ ایشیائی کھیلوں میں بڑی تعداد میں کھلاڑی حصہ لیتے ہیں۔اس لیے اس میں ایشیائی کھیلوں کا پیغام یعنی ایکائی۔دوستی اور ترقی کے ساتھ ساتھ مہمان نواز دیش کی اکثر کوئی نشانی بھی شامل کرنی پڑتی ہے سمجھے؟

جی ہاں!جی ہاں!ہم سبھوں نے حامی بھری۔

پھر پروفیسر چچا نے ہم سبھوں پر ایک بھرپور نگاہ ڈالی اور سگار پائپ کا کش لے کر کہنے لگے کہ ایشیائی اسپورٹس کمیٹی نے متفقہ طور پر فیصلہ کیا کہ ایشیائی کھیل ملک چین میں ہوگا تو اس اعلان کو سن کر ملک چین کی اسپورٹس کمیٹی نے اپنے ملک اور دنیا کے دوسرے ملکوں کے اخباروں میں Mascot کے ڈیزائن بنانے کا اشتہار دیا۔کہتے ہیں کہ دنیا کے مختلف ملکوں مثلاً امریکہ۔جاپان۔اور نیوزی لینڈ وغیرہ کے آرٹسٹوں اور چینی آرٹسٹوں نے تقریباً 9000(نو ہزار)Mascot کے ڈیزائن تیار کر کے ملک چین کی اسپورٹس کمیٹی کو بھیجا۔تمام ڈیزائنوں کو غور سے دیکھنے اور جانچنے کے بعد چین کی اسپورٹس کمیٹی نے بالآخر اپنے ہی ملک کے بنائے ہوئے آرٹسٹ کے ڈیزائن کو جو اس اخبار میں آپ دیکھ رہے ہیں جس کا سر بھالو کا ہے اور جسم بچے کا۔ایشیاڈ کھیلوں کا Mascot بنانے کا اعلان کیا۔

لیکن چچا جان!آپ نے یہ بتایا نہیں کہ یہ کیا شئے ہے۔جس کا سر بھالو کا ہے اور جسم بچے کا فارعہ نے چہک کر سوال کیا۔

ہاں بیٹا!یہ ایک نایاب اور بیش قیمتی جانور ہے جو مختلف ملکوں میں پایا جاتا ہے۔اس جانور کو'پانڈا' کہتے ہیں۔

چچا جان!چچا جان!آپ نے ملک چین کے اس آرٹسٹ کا نام نہیں بتایا جس نے یہ تصویر بنائی۔فہد بول پڑا۔

ہاں بھئی میں تو باتوں کے دوران اس آرٹسٹ کا نام بتانا بھول گیا۔سنو:اس آرٹسٹ کا نام ہے۔''مسٹر لیو چونگر بن''۔

مگر چچا جان!چین کی پرانی تہذیب کی نشانی''ڈریگون'' کا انتخاب نہ کر کے پانڈا کا انتخاب کیا حیرت کی بات نہیں ہے؟بلقیس آپا نے کہا جو پاس ہی کھڑی تھیں۔

ہاں بیٹا!یہ تو صحیح بات ہے کہ پانڈا کو ایشیائی کھیلوں کا Mascot یعنی Symbol منتخب کرنے کی بھی کئی وجہ ہوئی ہیں۔پہلی بات تو یہ ہے کہ'پانڈا' ایک عجیب وغریب جانور ہے۔جو بہت ہی شرمیلا ہوتا ہے۔دنیا میں اس کی تعداد محدود ہے اور صرف چین ہی میں پایا جاتا ہے۔دوسری بات یہ ہے کہ بین الاقوامی طور پر ورلڈ وائلڈ لائف World wide Life نشان بھی تسلیم کیا جاتا ہے۔تیسری بات یہ کہ دنیا کے سبھی ملکوں کے لوگ'پانڈا' کو پیار کرتے ہیں اور خاص کر یہ بچوں کا پسندیدہ جانور ہے۔چوتھی بات یہ کہ''پانڈا'' کے جسم پر خوبصورت بالوں کا کوٹ جیسا ہوتا ہے۔اس طرح یہ ایک نایاب جانور ہے۔ پانچویں اور آخری بات یہ کہ ان خصوصیات کی بنا پر پانڈا کو امن اور دوستی کا Symbol سمجھا جاتا ہے۔

مندرجہ بالا باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے اگر ملک چین کی اسپورٹس کمیٹی نے چین کی پرانی تہذیب'ڈریگون' کو جو ایک خطرناک اژدھا ہوتا ہے۔اس کا انتخاب نہ کر کے بچوں کا پسندیدہ۔دنیا بھر کے لوگوں کا پیارا اور نایاب بیش قیمتی جانور'پانڈا' کو ایشیاڈ کھیلوں کا Mascot یعنی Symbol کے لیے منتخب کیا۔اب بتاؤ یہ کیسا فیصلہ ہے؟

کہانی

"بالکل صحیح فیصلہ ہے۔" بلقیس آپا نے کہا۔

"لیکن بھائی صاحب! آپ تو جیسے پہیلیاں بجھا رہے ہیں۔ للہ اب اس نایاب اور قیمتی جانور کے بارے میں بھی تو کچھ بتائیں تاکہ ہمارے بچوں کی معلومات میں اضافہ ہو۔ ممی نے زور دے کر کہا۔

چچا جان! نے ہم سبھوں پر ایک بھرپور نگاہ ڈالی اور پھر یوں گویا ہوئے۔

ملک چین میں اس نایاب جانور 'پانڈا' کو 'بیشنگ' کہتے ہیں۔ یہ چین کے مغربی دکھنی حصہ کے پہاڑی خطوں میں پایا جاتا ہے، اس کی رنگت سیاہ وسفید اور جسم کی بناوٹ ریچھ جیسی ہوتی ہے۔ دم سے لے کر ناک تک اس کی لمبائی چھ فٹ اور وزن ڈھائی سو پونڈ تک ہوتا ہے۔ دونوں آنکھوں کے چاروں طرف گول کالے گھیرے ہوتے ہیں ناک کا اگلا حصہ اور کان کالے ہوتے ہیں۔ اگلے پیروں سے کندھے تک چاروں طرف کالی چوڑی پٹی ہوتی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ کالا ڈوپٹہ کندھے پر اوڑ رکھا ہے۔ اس کی آنکھیں دور تک نہیں دیکھ سکتی۔ لیکن چلنے کی طاقت تیز ہوتی ہے۔ پانڈا دن میں سایہ دار درخت کے اوپر سویا رہتا ہے۔ رات میں اپنی غذا کی تلاش میں نکلتا ہے۔ اس کی مرغوب غذا بانس کی پتیاں ہیں۔ اس کے علاوہ پودوں کی چھال۔ جڑیں۔ کیڑے۔ مکوڑے اور مچھلیاں بھی کھا لیتا ہے۔ پانڈا تقریباً آدھا دن کھانے میں صرف کر دیتا ہے۔ اپنی عادت کے مطابق غذا نہ ملنے پر فاقہ کشی کا شکار ہو جاتا ہے۔ یہ زیادہ تر تنہا رہتا ہے یا پھر اپنی بیوی بچوں کے ساتھ رہنا پسند کرتا ہے۔ اس کا اپنا کوئی گھر نہیں ہوتا بلکہ کھوکھلے حصے یا پھر پہاڑ کی کھوہ میں رہنا پسند کرتا ہے۔ ایک اندازے کے مطابق اس کی تعداد ایک ہزار سے کچھ زیادہ ہے۔ دنیا کے مختلف چڑیا گھروں میں اس جانور کی پرورش کی جا رہی ہے۔ اور ان کو ممکن حد تک قدرتی ماحول فراہم کی جا رہی ہے۔ لیکن ان کوششوں کے باوجود 'پانڈا' کی تعداد بڑھانے میں اب تک خاطر خواہ کامیابی نہیں ملی ہے۔ بلکہ دنیا سے ناپید

ہونے کا خطرہ باقی ہے۔اس کو بچانے کے لیے عالمی سطح پر کوشش کی جارہی ہے۔سمجھے؟

جی ہاں! بالکل! بالکل! ہم سبھوں نے کہا۔

لیکن چچا جان! ناک کالی۔کان کالے اور آنکھیں کالی اس پر طرۂ یہ کہ اس کے کاندھے پر عورتوں جیسا دوپٹہ بھی ہے۔ تو آپ ہی بتائیں کہ یہ ایک نایاب جانور ہونے کے ساتھ ساتھ کیا عورت جانور بھی کہلاتا ہے۔ تمکین نے سوال کیا؟

ہم سب کھل کھلا کر ہنس پڑے۔ممی بھی ہنس پڑیں۔چچا بھی مسکرا دیے۔چپ رہو! چپ رہو! کہتے ہوئے بولے۔یہ ایک اچھا سوال ہے اس کے متعلق بھی چین میں ایک لوک کہانی مشہور ہے۔لوسنو!

کہتے ہیں کہ 'پانڈا' کے ساتھ ایک دردناک واقعہ پیش آیا تھا۔جس کی وجہ سے اس کی آنکھ، ناک اور کان کالے ہوگئے اور کاندھے پر کالی پٹی جیسی پڑگئی۔ کہا جاتا ہے کہ پرانے زمانے میں چین کے علاقہ 'والوانگ' میں ایک سفید پانڈا رہتا تھا۔اس کے ساتھ ایک لڑکی بھی رہتی تھی۔وہ دونوں اس قدر مانوس تھے کہ ہمیشہ ساتھ ساتھ رہا کرتے تھے۔

ایک دن ایک چیتے نے اس سفید پانڈے پر حملہ کر دیا، وہ لڑکی پاس ہی کھڑی تھی فوراً چیتے پر جھپٹ پڑی اور اس سفید پانڈے کو چیتے کے پنجے سے زندہ چھڑا لیا مگر وہ لڑکی بہت زیادہ زخمی ہوگئی۔اس قدر زخمی ہوئی کہ آخر کار زخموں کی تاب نہ لا کر ایک دن وہ مرگئی۔کہا جاتا ہے کہ اس لڑکی کے کفن دفن کے وقت جنگل کے سارے پانڈے اکھٹے ہوگئے۔اور اس لڑکی کی یاد میں خوب روئے۔اتنا روئے کہ روتے روتے آنکھوں کے گرد کالے حلقے پڑگئے۔اگلے پنجوں سے یہ ملا ہوا تھا۔اس لیے وہ بھی کالا ہوگیا۔کیونکہ روتے وقت پانڈوں نے اپنے سر کو بار بار پیروں کے بیچ رکھا تھا۔رگڑ سے کان اور ناک کا اگلا حصہ بھی کالا پڑ گیا۔کہا جاتا ہے کہ اس وقت سے ہی سفید پانڈوں کی یہ حالت ہوگئی۔

لو کہانی ختم ہوئی۔اب مجھے اجازت دو اور تم سب بھی اپنے اپنے کمروں میں جاؤ۔ پروفیسر چچا نے کہا۔

اس کے بعد ہم سب چین کے اس 'پانڈا' کے متعلق سوچتے ہوئے اپنے بستروں میں جا گھسے۔جو واقعی عجیب وغریب اور حیرت انگیز جانور ہے۔

■

Hashmat Kamal Pasha
B-119, Nawab Wajid Ali Shah
Road Post Garden Reach
Kolkata-700024 (West Bengal)
Mob:6290479899

جوابات

(7) مچھلیوں کو الگ کرو

1	ب	پ	ت	ٹ	ث
2	ج	چ	ح	خ	
3	س	ش			
4	ص	ض			

رحیم رضا

تتلی رانی

تتلی رانی تتلی رانی
رنگ برنگی لال اور دھانی
ڈالی ڈالی اڑتی پھرتی
اتنی سی جاں اتنی پھرتی
بچے دیکھیں دوڑ لگائیں
پکڑیں لاکھ پکڑ کب پائیں
ٹھوکر کھائیں اور گر جائیں
منہ لٹکائے گھر کو آئیں
قدرت نے کیا رنگ دیے ہیں
ناز بھرے نازک سے دیے ہیں
رنگوں کی بارش ہے بن میں
چھونے کی خواہش ہے من میں
قدرت کا شہکار ہے تتلی
رنگوں کا اُبھار ہے تتلی

■

Raheem Raza
Raza Manzil,Khirnipura
Yawal,Jalgaon(Maharashtra)

شمیم اختر

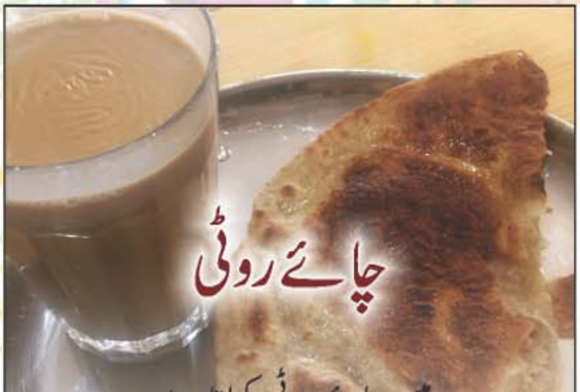

چائے روٹی

میں چائے روٹی کھاتا ہوں
سب کو کھیل دکھاتا ہوں
دے کے زباں میں یاروں کو
وعدہ اپنا نبھاتا ہوں
ڈرتا ہوں جب یار کبھی تو
گیت پرانے گاتا ہوں
اور میداں میں آتے ہی
چھکے، چوکے لگاتا ہوں
دو سے دس تک اب بھی یارو!
ٹیبل کو دہراتا ہوں
چاہے سردی یا گرمی ہو
پڑھنے وقت سے جاتا ہوں
ممی سوئی رہتی ہیں تو
میں ہی چائے بناتا ہوں
پوچھ لو اختر انکل سے
بس چائے روٹی کھاتا ہوں

■

Shamim Akhtar
5, P. M Bustee 4th Lane
Shibpur, Howrah-2 (West Bengal)

نویں قسط

اردو زبان کا جادو

پیارے دوستو! 'بچوں کی دنیا' آپ سب کا اپنا رسالہ ہے۔ ہماری کوشش رہتی ہے کہ رسالے میں زیادہ سے زیادہ دلچسپ اور کارآمد تحریریں شائع کی جائیں۔ اِس رسالے کی اشاعت کا سب سے اہم مقصد یہ ہے کہ ہم اپنی زبان اردو کو فروغ دیں اور زیادہ سے زیادہ لوگ اس زبان کو سیکھیں۔ کسی بھی زبان کو سیکھنے کے لیے اگر اس میں کھیل اور مزے کو شامل کرلیا جائے تو سیکھنے میں دلچسپی بڑھ جاتی ہے۔ ہم نے اردو زبان کے لسانی کھیلوں پر مشتمل ایک سلسلہ شروع کیا ہے جو قومی اردو کونسل سے شائع کتاب 'اردو زبان کا جادو' سے لیا گیا ہے۔ امید ہے کہ آپ سب اس سلسلے کو پسند کریں گے۔ (ادارہ)

اِس ذہنی آزمائش کے جوابات اِسی شمارے میں آپ کو مل جائیں گے۔

(9) مچھلیوں کو الگ کرو

مقصد : ہم شکل حروف کی پہچان

ہدایت : جال میں مچھلیوں کے علاوہ بھی سمندری مخلوق کی کئی اور قسمیں پھنس گئی ہیں۔ مچھلیوں کے علاوہ انھیں بھی قریب کے برتنوں میں الگ الگ رکھیے۔

کھلاڑی:1 وقت:2 منٹ نمبر:4

مآخذ: اردو زبان کا جادو (پارٹ 1)، ادارہ، **سنہ اشاعت:** تیسری طباعت 2009، **ناشر:** قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

تیسری قسط

انسانیت

مصنف: انیس اعظمی

مصور: فجر الدین

قبائلی عورت : ارے میری بچّی کو مار ڈالا اسکول والوں نے.............ارے میں نے اِسے بے پھجول اِی ہاں بھیجا
.............میری بٹیا کو بچالو۔

قبائلی 2 : اگر تیرے چلّانے اور ہلّا مچانے سے بٹیا ٹھیک ہو جائے تو اور جور سے ہلّا مچالے.............بے پھجول میں چلّاتی ہے۔ دیکھو بھلا پریسانی میں اور پریسانی سَسُری۔

(ابھی قبائلی عورت پوری طرح چپ بھی نہیں ہوئی تھی کہ ایک پندرہ سولہ برس کا لڑکا دھیرے دھیرے چلتا ہوا زخمی لڑکی کی چارپائی کے پاس آتا ہے۔ وہ تھک کر لڑکی کو دیکھتا ہے اور بے چین ہو جاتا ہے۔ وہ پریشان ہو کر تھوڑا فاصلے پر اوروں سے ہٹ کر اُکڑوں بیٹھ جاتا ہے اور رونے لگتا ہے۔ ایک نن (نینسی) اس کے پاس آ کر اُسے سمجھانے لگتی ہے۔)

نینسی : ارے آشیش ایسا کیوں روتے ہو.............کیا یہ تمھارا سسٹر ہے!
(آشیش سسکتے ہوئے گردن ہلا کر انکار میں جواب دیتا ہے۔)

نینسی : آشیش تم دُکھی مت ہو علاج ہونے پر یہ ٹھیک ہو جائے گا نا.............تم روتا کیوں ہے.............یہ لڑکی تمھارا کون ہے؟

آشیش : یہ ہمارا دوست ہے، ہمارے گاؤں کا ہے۔

نینسی : اوہ اچھّا تو یہ تمھارا دوست ہے، تمھارا دوست کا نام کیا ہے بولے تو؟

آشیش : اِس کا نام دُرگی ہے۔

نینسی : دُرگی؟.............دُرگی نہیں، دُرگا ہوگا۔ (آشیش نفی میں سَر ہلاتا ہے۔)

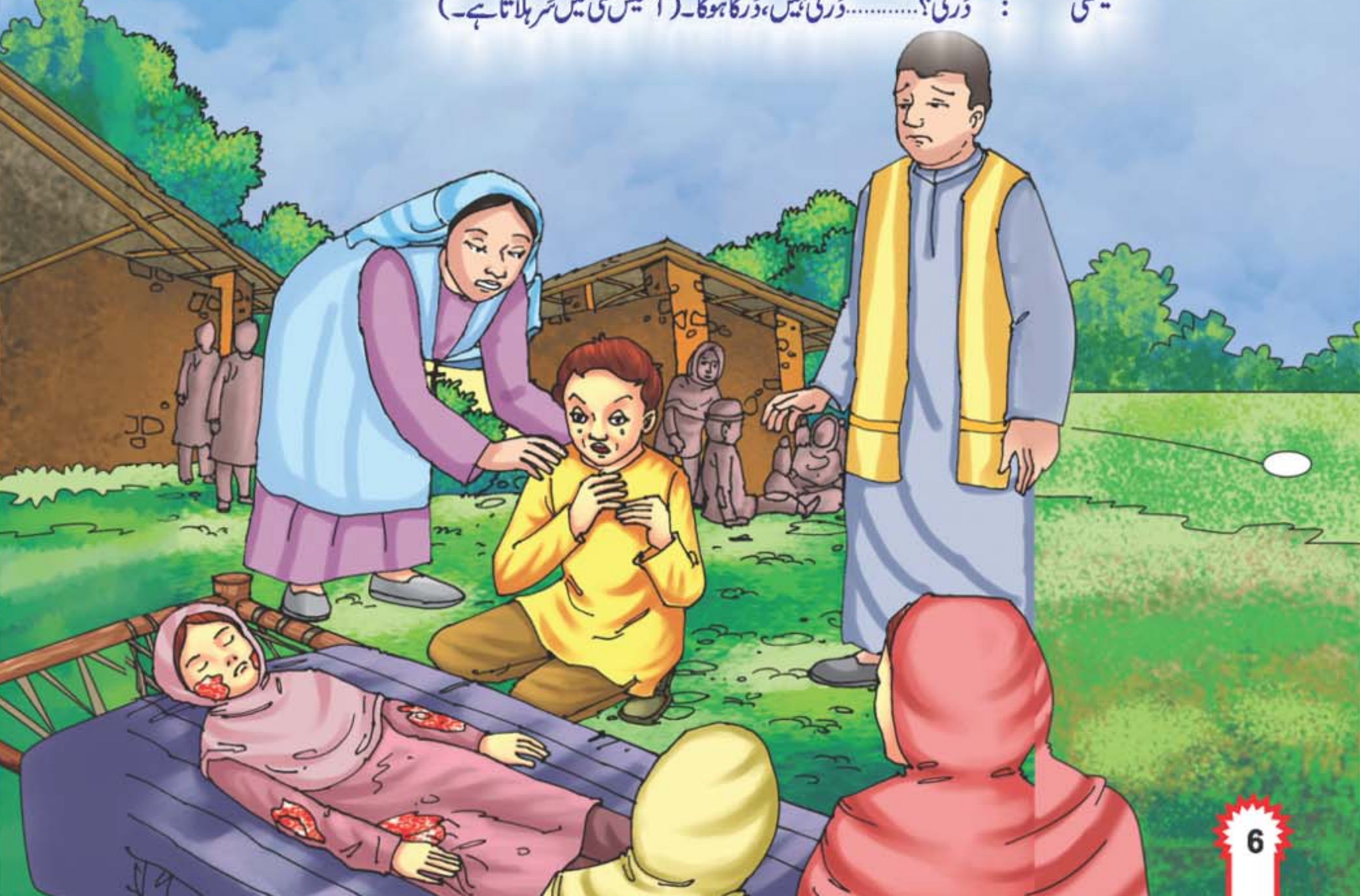

(کچھ فاصلے پر کھڑے فادر غور سے دور دیکھتے ہوئے اونچی آواز میں اور جذباتی لہجے میں کہتے ہیں۔)

فادر : آپ لوگ سنا۔اِدر آتا ہوا جیپ کا آواز سنا......اوہ یَس یہ جیپ کا آواز ہے.....مطلب میڈیکل ٹیم اِدر آتا ہے۔

(سبھی لوگ دھیان لگا کر جیپ کی آواز سُننے کی کوشش کرتے ہیں۔اب جیپ کی آواز کافی نمایا ہے۔جیپ کی آواز بہت قریب آگئی ہے..........انجن بند ہونے کی آواز آتی ہے اور اُسی کے ساتھ جیپ کا دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز آتی ہے۔اسٹیج پر موجود سبھی لوگ بے چینی سے وِنگز کی طرف دیکھتے ہیں۔اگلے ہی پل تیز قدموں سے چلتا ہوا فوجی وردی میں ایک ڈاکٹر اور دو نرسیں اسٹیج پر داخل ہوتے ہیں تینوں کے ہاتھوں میں دوائیاں اور مرہم پٹّی کا سامان ہے۔فادر آگے بڑھ کر ڈاکٹر سے ہاتھ مِلاتا ہے اور تیزی سے زخمیوں کی طرف اِشارہ کرتا ہوا معاملے سے آگاہ کرتا ہے۔ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق فادر اسٹیج پر موجود لوگوں سے اونچی آواز میں کہتا ہے۔)

فادر : سب لوگ زخمی بچہ لوگ کے پاس سے ہٹ جایئے، چلو دور ہٹو ہوا کو کُھلا آنے دو، سب لوگ پیچھے ہٹیں اور ڈاکٹر ساب کو اپنا کام کرنے دیں۔

(بھیڑ پیچھے ہٹتی ہے۔فوجی ڈاکٹر نرسوں کے ساتھ جُھک کر زخمی بچّی کا نبز معائنہ کرتا ہے؟اِسی درمیان دونوں نرز اِیک بڑی سی میز کو لے کر وہاں آتی ہیں۔نرس دوائیوں کے تھیلیوں کو میز پر رکھتی ہیں۔نیز نرس کی مدد کرتی ہیں۔ایک نرس زخمی بچّی کی چوٹ کو صاف کرنے لگتی ہے۔تبھی ایک قبائلی دوڑ کر لوہے کی بالٹی میں پانی لے کر آتا ہے اور ڈاکٹر کے پاس رکھتا ہے۔اور اِشارے سے پانی پینے کو کہتا ہے۔)

فوجی ڈاکٹر : No, Thanks, and please do not disturb us.

(قبائلی کھسیا کر بالٹی اُٹھا کر پیچھے جا کر بیٹھ جاتا ہے۔اُس کے پاس بیٹھا قبائلی ہلکی آواز میں اُس سے پوچھتا ہے۔)

قبائلی 1 : کا بولے ڈانگڈر ساب؟

قبائلی 2 : جانے کا بولے..........پر انگریجی بھاسا میں بولے۔ (دونوں ہنستے ہیں، ڈاکٹر گھور کر دیکھتا ہے۔)

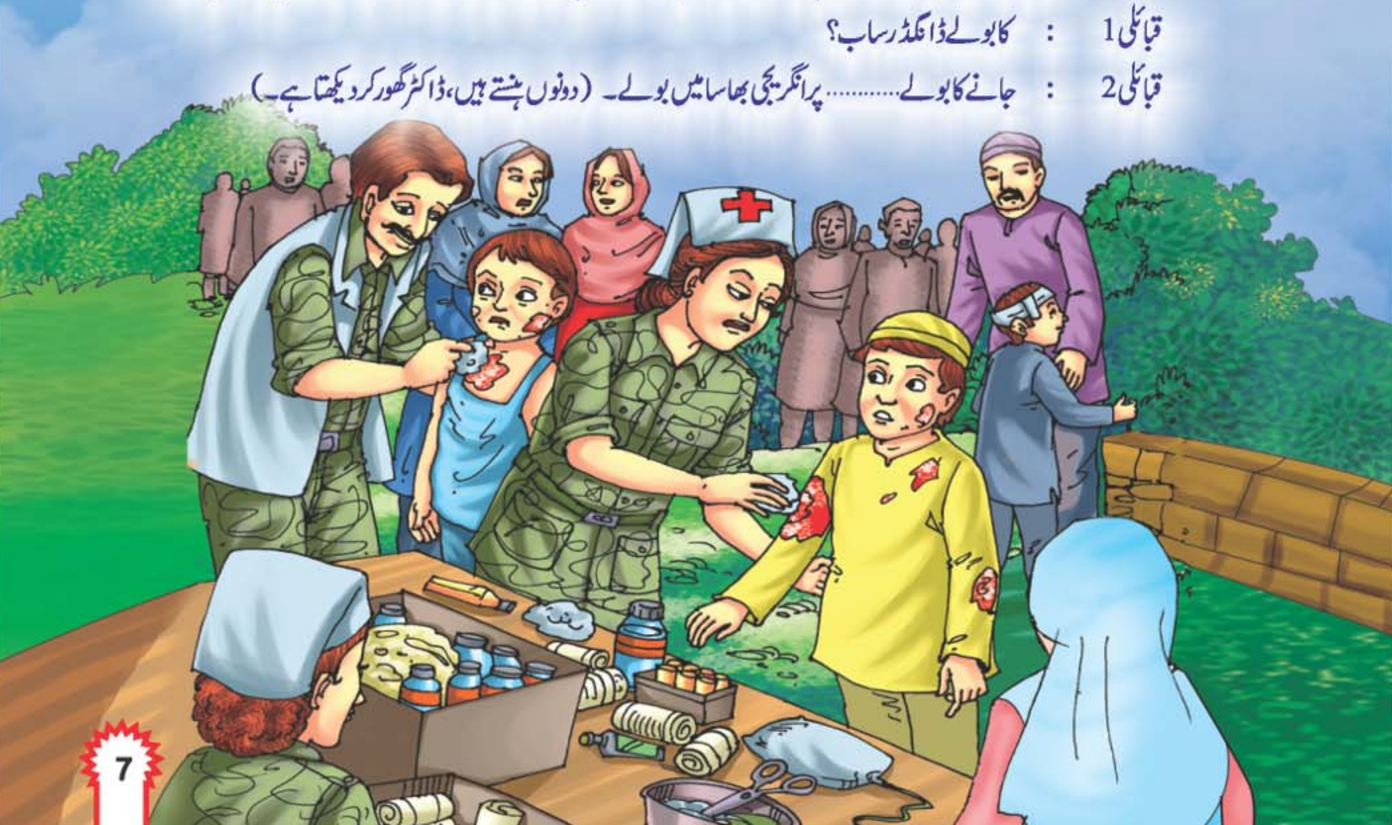

فوجی ڈاکٹر : You are again disturbing me

قبائلی2 : دیکھا............پھر انگریجی بولا۔(دھیرے سے)

(ایک نرس ایک زخمی لڑکے کی مرہم پٹی کر رہی ہے، ڈاکٹر اور دوسری نرس دُرگی کے زخموں کو روئی سے صاف کر رہے ہیں، ڈاکٹر اٹھ کر فادر سے کہتا ہے۔)

فوجی ڈاکٹر : She is very critical due to loss of blood, therefore blood is required immediately, and presently we don't have blood.

فادر : بچّی (کا بلڈ گروپ کیا ہے یہ تو دیکھیے۔

فوجی ڈاکٹر : اَم برابر دیکھے گا۔.That is our job

(ایک نرس میز پر رکھّی سلائیڈ پر دُرگی کی انگل سے پن چُبھا کر ایک بوند خون نکالتی ہے اور پاس رکھے ڈِبّے سے ایک بوند کیمیکل اُس پر ٹپکاتی ہے اور پھر سلائیڈ کو غور سے دیکھتی ہے)

قبائلی عورت: ہے بھگوان میری دُرگی کا کھون بھی نکال لیا(چلاّ کر روتے ہوئے) ارے کوئی میری دُرگی کو بچاؤ۔

فوجی ڈاکٹر : (عورت سے)Will you please keep quiet

قبائلی1 : درگی کی ماں سے بھی ڈانگڈر انگریجی بولا۔

قبائلی2 : اس کو لگتا ہے ہم لوگ بھی سکول پڑھے ہیں۔

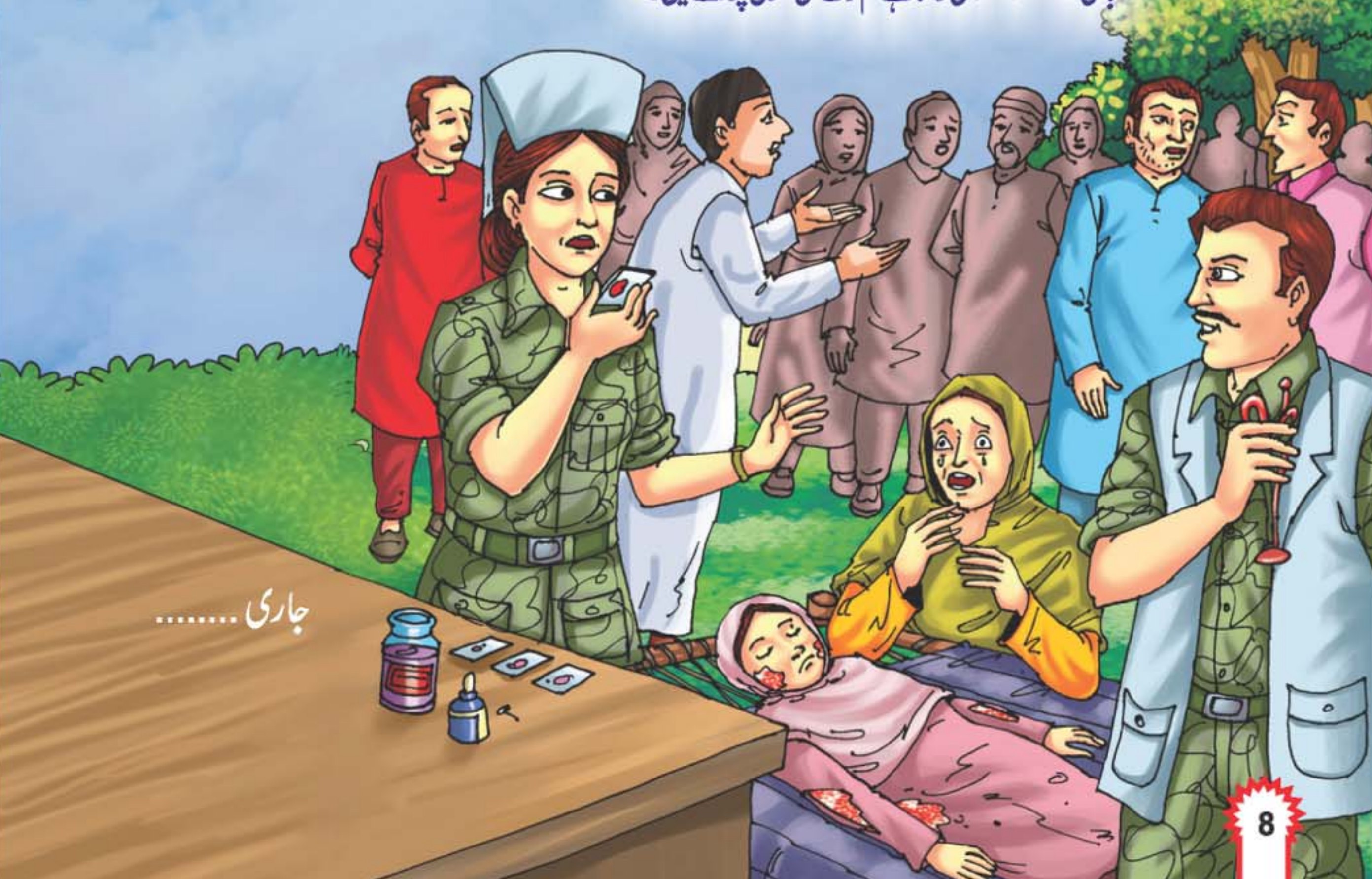

جاری ....

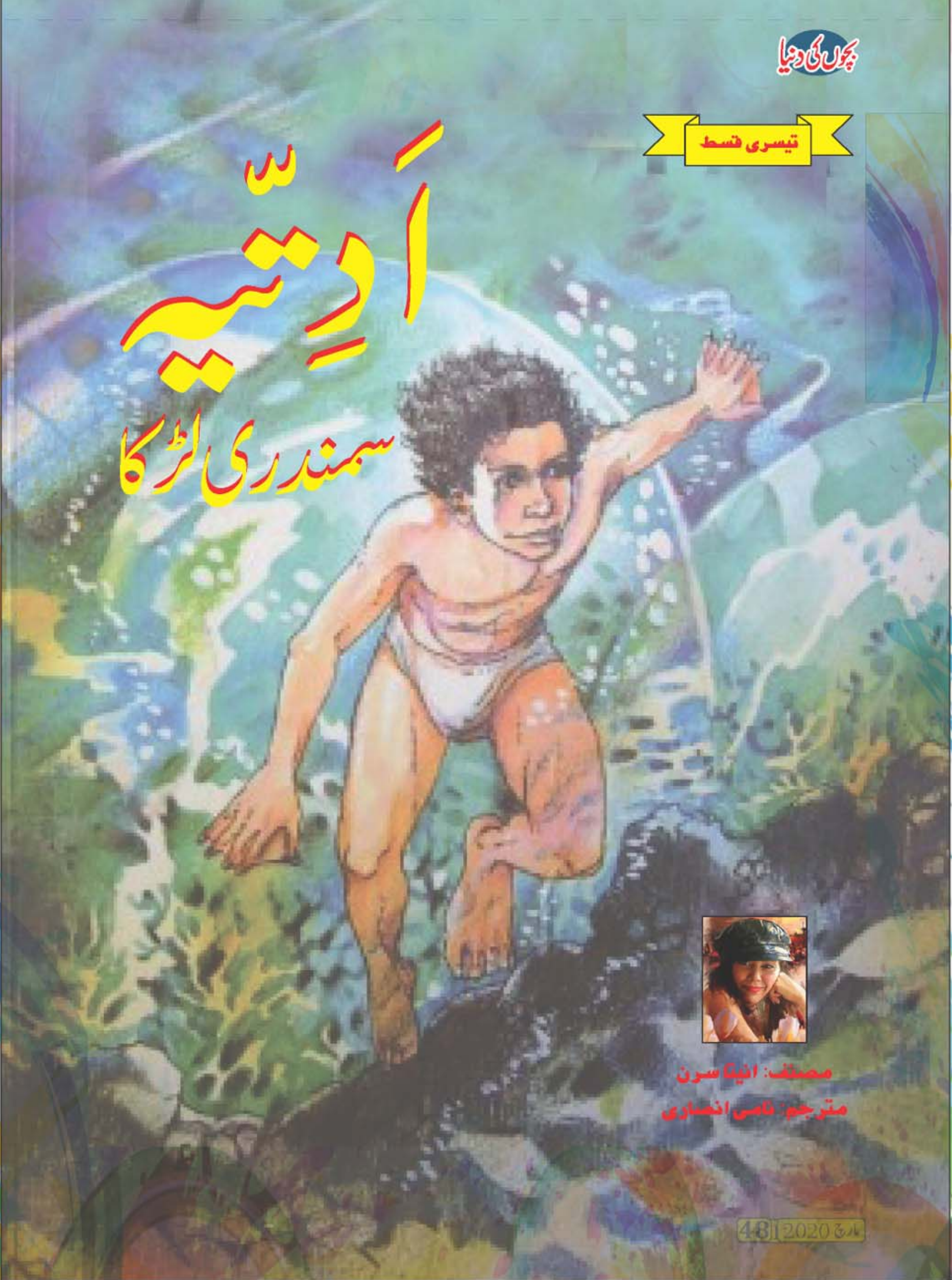

تیسری قسط

اَدِتیّہ

سمندری لڑکا

مصنف: انیتا سرن

مترجم: نامی انصاری

قسط وار ناول

پروفیسر سین سمندر اور سمندری مخلوقات پر ریسرچ کررہے ہیں۔ انھوں نے اپنے جین سے ایک سمندری انسان تیار کیا تھا جو آدھا انسان اور آدھا ڈولفن تھا۔ جو انسانوں کی طرح بات کرتا ہے۔ ڈولفن کی باتیں سن سکتا ہے۔ انھیں جواب دے سکتا ہے، اس انوکھی مخلوق کا نام ادتیہ تھا۔ پروفیسر سین نے سمندر کی گہرائی میں دفن راز اور ڈولفن سے متعلق معلومات حاصل کرنے کے لیے اسے بنایا تھا۔ آدتیہ بہت سمجھدار لڑکا ہے۔ وہ سمندر کے طویل سفر پر روانہ ہوتا ہے۔ سمندری سفر پر روانہ ہونے سے پہلے ایک آکٹوپس نے ادتیہ پر حملہ کیا لیکن ایک ڈولفن نے اس کی جان بچائی اور آکٹوپس کو مار بھگایا۔ پندرہ ڈولفن مچھلیوں نے طویل سفر شروع کیا۔ ادتیہ ان مچھلیو ں کی 'لیڈر کی' کی پیٹھ پر بیٹھ کر سمندری سفر پر روانہ ہوگیا۔ شکاری موٹربوٹ سے بچتے ہوئے یہ سبھی لوگ آسٹریلیا پہنچ جاتے ہیں۔ ایک دن انھیں ڈاکوؤں کا ایک جہاز سمندر کی تہہ میں نظر آتا ہے۔ اس جہاز کے کیپٹن کی لاش کے ہاتھ میں ایک لاکٹ تھا جسے ادتیہ نے دیکھا اور اس لاکٹ کے اندر سے ایک کاغذ نکلتا ہے جس میں اس شخص کا اپنی بیوی کے لیے پیغام ہوتا ہے۔ ادتیہ اُسے پڑھتا ہے اور لاکٹ کو وہیں چھوڑ دیتا ہے۔ اب آگے

ستارے

لہروں کے نیچے ایک میٹھی اور زوردار موسیقی کی آواز شروع ہوگئی۔ ''یہ بانسری مچھلی ہے'' کی نے چیخ کر کہا اور اس کے غوطہ مارنے سے ادتیہ بھی چوکنا ہوگیا۔ دھنک کے رنگوں والی سیکڑوں مچھلیوں کے لمبے لمبے ننھنے بانسری کی طرح آگے نکلے ہوئے تھے۔ دوسری تمام ڈولفن مچھلیاں ادتیہ اور کی کے چاروں طرف جمع ہوگئی تھیں اور خاموشی سے اس موسیقی کا لطف اٹھا رہی تھیں۔

ادتیہ اپنے کھوہ کی طرف تیر گیا جس کی دیواروں پر اس نے سرخ ریشم لپیٹ رکھا تھا۔ اس موسیقی نے پورے ماحول کو بڑا رومانی بنا دیا تھا ''تعجب ہے کہ پاپا نے مجھے ان بانسری مچھلیوں کے بارے میں کچھ نہیں بتایا جب کہ انھوں نے یہ ضرور کہا تھا کہ سمندر کی تہہ میں بڑی عجیب وغریب چیزیں موجود ہیں۔ کیا مجھے یہاں کچھ اور نئی چیزیں ملیں گی؟'' ادتیہ نے بڑی دلچسپی سے یہ منظر دیکھا کہ ڈولفن مچھلیاں کی کی اگوائی میں ڈانس کرنے لگی تھیں۔ وہ اپنے چمکیلے جسموں کو ایک دوسرے کے گرد لے جاتیں اور موسیقی کے تال اور سُر پر کانوں کو ایک ساتھ ہلا دیتیں۔ یہ ڈانس آدھ گھنٹے تک جاری رہا۔ پھر کی ادتیہ کے پاس پہنچ گئی۔ ''یہ بڑا خوب صورت اور دل چسپ منظر تھا'' ادتیہ نے کہا ''وھیل مچھلیاں بھی گانا گاسکتی ہیں۔'' کی نے جواب دیا ''کس طرح کا گانا؟'' اسی طرح کا جیسے سب گاتے ہیں۔ پریم، ہیرو، سورج، سمندر، ستارے...

''کیا تم ستاروں کو دیکھنا چاہو گے ادتیہ؟'' جب وہ پانی کی سطح سے اوپر آئے تو رات کے سہانے منظر نے ان کو حیران کر دیا۔
''کیا تم جانتی ہو کی!'' ادتیہ نے کہا ''ستارے اس لیے چمکتے ہیں کیونکہ ان کے اندر کی ہائڈروجن گیس جل کر ہیلیم میں بدل جاتی ہے جس سے سخت گرمی پیدا ہوتی ہے۔ جب ساری ہائڈروجن گیس ہیلیم میں تبدیل ہو جاتی ہے تو ستارے ایک بہت بڑی سرخ گیند کی شکل اختیار کر لیتے ہیں یعنی اپنے اصل جسم سے سیکڑوں گنا زیادہ بڑے ہو جاتے ہیں۔ پاپا کہتے تھے کہ چھ کروڑ سال بعد سورج جو کہ اصل میں ایک ستارہ تھا، پھول کر ایک بہت بڑی گیند بن جائے گا اور یہ مرکری اور وینس دونوں کو نگل کر دنیا کے مدار کے بہت قریب پہنچ جائے گا۔ ہماری دنیا اس آگ کی وجہ سے بھاپ بن کر اڑ جائے گی اور شاید اس وقت ہم کسی دوسرے سیارے میں ہوں گے۔''
''بہت دل چسپ!'' کی نے کہا ''لیکن میں اب بھی سورج کو اپنے رتھ پر آسمان کی یاترا کرتے ہوئے دیکھنا پسند کرتی ہوں۔'' پھر آسمان پر ایک سب سے زیادہ روشن ستارے کی طرف دیکھتے ہوئے کی نے کہا ''ادتیہ! کیا تم اس ستارے کو دیکھ رہے ہو؟'' ''ہاں! یہ سائرس اے ہے۔ ایک اور ستارہ سائرس بی اس کے ارد گرد گھومتا ہے۔ لیکن یہ دکھائی نہیں دیتا۔'' ادتیہ نے جواب دیا ''لیکن افریقی ڈوگون اس نظر نہ آنے والے ستارے کے بارے میں آج کے ستارہ شناسوں سے بہت پہلے ہی جانتے تھے۔'' کی نے کہا ''ادتیہ نے تعجب سے پوچھا کہ ان کے پاس تو آج کے سائنسی آلات نہیں تھے۔ ان کو اس ستارے کے بارے میں کیسے معلوم ہوا تھا۔
''صرف یہی نہیں'' کی نے کہا ''وہ اس ستارے کے بارے میں بھی جانتے تھے جو سائرس بی کے گرد گھومتا ہے۔'' ''ان کا عقیدہ تھا کہ سارے جاندار ڈولفن گاڈ نوموں نے پیدا کیے ہیں۔ نوموہی نے پہلے انسان کو اس زمین پر پیدا کیا اور اس کو کھیتی

باڑی کا کام سکھایا۔ یہ نوموہی تھا جس نے ان کو اس نظر نہ آنے والے ستارے کے بارے میں سوچ کر مجھے مزہ آتا ہے۔"

"افریقہ میں یہ ڈوگون کہاں رہتے ہیں؟" ادتیہ نے کی سے پوچھا۔ "صحارا کے ریگستان میں" کی نے جواب دیا "یہ تو واقعی بڑا دلچسپ معاملہ ہے کی۔ یعنی سمندر سے اتنے زیادہ فاصلے پر رہ کر بھی سمندر کے جانداروں سے تعلق قائم رکھنا۔" دراصل نومو نے دو ستاروں کی تصویر بنا کر ان کو بتایا کہ سائرس بی کس طرح سائرس اے کے گرد گھوم کر پچاس سال میں اپنا ایک چکر پورا کر لیتا ہے اور وہ ایک ایسی دھات سے بنا ہے جس کی ابھی دنیا والوں کو جانکاری نہیں ہے۔" "اچھا! یہ بتاؤ ادتیہ کہ کیا تم میری کہانی کو درست سمجھتے ہو یا اپنی کہانی کو؟" میں تمھاری کہانی کو زیادہ درست سمجھتا ہوں اگر چہ یہ سائنسی نہیں ہے لیکن زیادہ حیرت انگیز اور دل چسپ ہے۔"

کی نے کہا

ادتیہ ڈولفن مچھلیوں سے کھیل رہا تھا جب انھوں نے ایک عجیب قسم کے گانے کی آواز سنی جو ڈھول کی ہلکی آواز سے ملتا تھا۔ کی نے اچانک پانی میں غوطہ لگایا۔ "یہ کون گا رہا ہے؟" ادتیہ نے ساحل کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "یہ شامن کا مقدس گانا ہے، وہ مجھے بلا رہا ہے۔" کی نے جواب دیا "کیا یہ وہی ہے جس سے تم دماغ سے دماغ تک بات کرتی ہو؟"

"ہاں" "مگر وہ تمھیں کیوں بلا رہا ہے!" "اس کا خیال ہے کہ ہم لوگ قریبی رشتہ دار ہیں۔ یعنی اس کے پرکھے ڈولفن تھے جو بعد میں زمین پر پہنچ گئے۔" غالباً وہ یہ سمجھتا ہے کہ تم ایک دیوی ہو اور اس کے پرکھوں سے تمھارا رشتہ ہے۔"

"میں نہیں سمجھتی کہ میں ایک دیوی ہوں لیکن میں اس کو

ایسی طاقت دیتی ہوں کہ وہ اپنے لوگوں کو مطمئن کر سکے۔ میں اس کو یہ اس وقت دیتی ہوں جب اس کو اس کی ضرورت ہوتی ہے۔'' کیا واقعی ایسا ہوتا ہے؟'' ہاں میں سمجھتی ہوں کہ ایسا ہوتا ہے۔ کبھی کبھی ہم لوگ ہوائی جزیرے کے ساحل تک پہنچ جاتے ہیں۔ وہاں کے لوگ ہماری اس طاقت پر یقین رکھتے ہیں اور اپنے بیمار بچوں کو ہمارے ساتھ ساتھ تیرنے دیتے ہیں اور ان کی بیماری ٹھیک ہو جاتی ہے۔''

''کیا یہ لوگ بھی آسٹریلیا کے پراچین قبیلوں کی طرح کے ہوتے ہیں؟'' ''نہیں نہیں! یہ لوگ تو بڑے ماڈرن انسان ہیں۔ اب مجھے جانا چاہیے ادتیہ! کیا تم میرے ساتھ چلو گے؟''

''میرے لیے باہر کی دنیا میں دکھائی پڑنا خطرناک ہوگا۔ میں یہیں تمھارا انتظار کروں گا۔'' ادتیہ نے نرمی سے جواب دیا۔

ایک کالا اَدھ ننگا آدمی ساحل پر اس وقت مسکرانے لگا جب اس نے 'کی' کو اتھلے پانی کی طرف آتے ہوئے دیکھا۔ اس نے گانا بجانا بند کر دیا اور ساحل پر خاموشی سے بیٹھ گیا۔ اس کی آنکھیں ادھ کھلی تھیں۔ وہ کی سے دماغ کی راہ سے بات کر رہا تھا۔ کی کا پیٹ اس وقت بالو پر ٹکا تھا۔ دونوں نے ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھا، ''اے سمندر کی مقدس دیوی! ایک آدمی یہاں سے کافی دوری پر مر رہا ہے۔ میں کیا کروں؟'' اس کالے آدمی نے لجاجت سے کہا۔

''تم فوراً ٹیلے کی سرنگ سے نیچے کی دنیا کی طرف جاؤ۔ وہاں تمھیں ایک طاقت کا آکار ملے گا اس کو فوراً اپنے خیال کے بازوؤں پر اس بیمار آدمی کے پاس روانہ کر دو۔ اس طاقت کی صاف تصویر اپنے دماغ میں قائم کر لو۔ یہ سب کرنے کے بعد تم میری طاقت کو بلاؤ۔ جب یہ طاقت تمھیں محسوس ہو جائے تو اسے طاقت آکار کے پاس بھیج دو تا کہ اسے ناچنے کی انرجی مل جائے۔ اس کو بیمار کے جسم کے پاس ناچنے دو۔ لیکن اس بات کا خیال رکھنا کہ میری طاقت کو کہیں سیدھے بیمار آدمی کے پاس مت بھیج دینا کیونکہ یہ اس بیمار آدمی کو اپنے زور میں نقصان پہنچا دے گی۔ اچھا اب رخصت!'' کالے آدمی نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور اپنا ڈھول اسی انداز سے پھر بجانے لگا جیسے وہ پہلے بجا رہا تھا۔ کی ادتیہ کے پاس واپس پہنچ گئی۔ ادتیہ یہ سب کچھ بڑی دلچسپی اور تعجب سے دیکھ رہا تھا۔

''تم کچھ الجھن میں دکھائی دیتے ہو'' کی نے ادتیہ سے پوچھا'' یہ سب کیا ہے۔ طاقت آکار، نچلی دنیا، کیا واقعی ٹیلوں کے راستے اس نچلی دنیا میں پہنچا جا سکتا ہے؟'' اصلیت میں ایسا نہیں ہے۔ یہ ایک دماغی سفر ہے جو شامن طے کرے گا۔ طاقت آکار اس طرح کی صرف ایک نشانی ہے جس سے وہ میری طاقت کو اپنے بیمار دوست تک پہنچائے گا۔ دیکھو ادتیہ! ''سمبل یا نشانی اس کے خیال کے راستے کو آسان بنا دیتا ہے۔ یہ تو وہی چیز ہے جیسے پجاری اگنی کی پوجا کرتے ہیں۔ قریب قریب ہر مذہب میں سمبل کے ذریعے ہی خیالات کو یکجا کیا جاتا ہے۔ یوگی بھی اسی طرح خاص قسم کے منتر پڑھتے ہیں یا کمل کے پھول کے سمبل پر گیان دھیان لگاتے ہیں۔''

''میں نے اس کے بارے میں سنا ہے۔ میرا خیال ہے کہ تم نے یہ سب بادل دوست (بھاپ) سے سیکھا ہے۔ ہاں تم کہہ سکتے ہو کہ بھاپ ہی ہماری ٹیچر ہے۔ لیکن اس میں سب سے زیادہ مزے کی بات یہ ہے کہ آدمی بھی کسی وقت ڈولفن کی صورت میں تھا۔'' میں تمھیں شامن کا قصہ سناؤں گی۔ اس کو سپنے کا سمے کہتے ہیں۔

سپنوں کا زمانہ

''بہت زمانے پہلے'' کی نے کہا، ''جب زمین نئی نئی بنی تھی، اس وقت زندگی کی انرجی نے جانور، چڑیا اور مچھلی کی شکل اختیار کی۔ انھیں میں سے کچھ ڈولفن اور انجینا تھیں جو پانی میں چٹانوں کے آس پاس رہتی تھیں۔ ان دنوں ڈولفن مچھلیاں آج سے بہت چھوٹے آکار کی ہوتی تھیں۔ وہ بہت خوش خوش اور بے فکری سے چمکتی دھوپ میں سمندر کی سطح پر دھوپ کا مزہ لیتی تھیں یا سمندری گھاس سے کھیلتی تھیں۔ اکثر وہ پانی سے اوپر ہوا میں چھلانگ لگا کر قلابازیاں کھاتی تھیں اور پھر سمندر میں ایک چھپاکے کے ساتھ آ کر گر جاتی تھیں۔ کبھی وہ گہرے سمندر کی تہہ تک چلی جاتی تھیں، جہاں سیب دار مچھلیاں اور مونگے رہتے تھے۔

یاکونا نے اپنے رہنے کے لیے سیپ کی خوبصورت اور مضبوط شیل بنا لیے تھے۔ وہ بھی ایک قسم کی سیپ دار مچھلیاں ہی تھیں جو سمندر کے ساحل کے قریب گھومتے ہوئے کیڑوں مکوڑوں سے اپنا پیٹ بھر لیتی تھیں۔ یاکونا کو سمندر میں سب سے زیادہ ہوشیار سمجھا جاتا تھا۔

ڈنگن جَبانا (جس کو اب ہم صرف ڈنگن کہیں گے) ڈولفنوں کا لیڈر تھا۔ وہ بڑا مضبوط، ہمت والا اور بہادر تھا لیکن اس کی ساتھی گنا جا بہت محتاط اور جستجو پسند تھی۔ وہ دن بھر ڈولفنوں کے ساتھ کھیلتی ہی نہیں رہتی تھی بلکہ اپنا زیادہ سے عقل مند یاکونا کے ساتھ سمندر اور اس کے باسیوں کے بارے میں جانکاری حاصل کرنے میں بِتاتی تھی۔ ڈنگن کو یہ پسند نہیں تھا کہ اس کی ساتھی ہر وقت یاکونا کے ساتھ رہے۔ وہ اس کی ہنسی اڑاتا مگر گنا جا نے اس کے چڑنے پر توجہ نہیں دی۔ کیونکہ اسے یاکونا سے بڑی دل چسپی تھی۔ اس سے ڈنگن اور زیادہ غصے میں آ گیا اور اپنی طاقت ور دُم سے یاکونا کے بالکل قریب ایسی اچھال ماری کہ نمکین پانی یاکونا کے منہ میں چلا گیا۔

یاکونا اگرچہ گنا جا سے پیار کرتا تھا لیکن اس واقعے سے وہ تمام ڈولفنوں کے بارے میں شک میں پڑ گیا۔ ان کے لیڈر

بارنگوا نے اس پر اپنی ناراضگی بھی ظاہر کی اور کہا کہ انجینا کو سلیقہ نہیں۔ وہ ہمیشہ فریب دیتے ہیں۔ وہ اتنی زور زور سے بولتے ہیں کہ اپنی آواز خود ہی سن سکتے ہیں اور وہ بہت کم عقل کی بات کرتے ہیں۔

جب ڈنگن کو معلوم ہوا کہ بارنگوا نے اس پر نکتہ چینی کی ہے تو اسے اور زیادہ غصہ آ گیا۔ ایک دن وہ یاکونا کے اسی لیڈر کے پیچھے لگ گیا اور موقع پا کر اس پر اپنی ناک سے اتنی زور کی ٹکر ماری کہ وہ اس مونگے کی چٹان سے الگ ہو کر سمندر کے کنارے گر گیا۔ اس نے کہا ''بارنگوا خاموش رہو ورنہ میں تم کو ایسی ٹکر دوں گا کہ تم زمین پر جا گرو گے اور وہاں تمھارا خاتمہ ہو جائے گا۔''

گنا جانے کوشش کی کہ وہ اپنے دوستوں کو شانت کر دے لیکن وہ کامیاب نہیں ہوئی۔ ڈنگن کی اس دھمکی سے وہ اپنے لیڈر کی زندگی کے بارے میں بہت فکر مند ہو گئے۔ گنا جانے ان کو تسلی دی کہ ڈنگن کو جب بہت غصہ آتا ہے تو وہ ایسی دھمکیاں دے ڈالتا ہے لیکن اس کا مطلب اس پر عمل کرنا نہیں ہوتا لیکن یاکونا کو اس سے تسلی نہیں ہوئی۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ حسد بڑی ڈراؤنی چیز ہے۔ وہ ڈنگن کے بے قابو غصے سے بھی واقف تھے۔ بارنگوا نے ڈنگن اور اس کے ساتھیوں کو سبق سکھانے کے لیے اپنے دوست 'مانا' (شارک مچھلی) کو بلانے کا فیصلہ کیا۔ اس طرح دوسرے دن جب ڈولفنوں نے یاکونا کو چڑانے کا کام پھر سے شروع کیا تو بارنگوا نے چلا کر ان سے کہا ''بھاگ جاؤ، ورنہ میں مانا کو بلاتا ہوں۔''

اس وقت تو ڈولفنیں کھسک گئیں لیکن جب انھوں نے دیکھا کہ برنگوا نے مانا (شارک) کو نہیں بلایا تو پھر یاکونا کو چڑانے لگ گئیں۔

مانا (شارک) بہت بڑی اور چکنی مچھلی تھی اور اس کے منہ کے اندر تیز دانتوں کی کئی قطاریں تھیں۔ وہ ڈولفنوں کی زبردست دشمن تھی۔ وہ چھپ کر ڈولفنوں کا انتظار کرتی اور جب کوئی ڈولفن اس کے پاس سے گزرتی تو وہ اس پر ٹوٹ پڑتی اور اپنے دھاردار دانتوں سے اس کو اس طرح کاٹ ڈالتی کہ سمندر کا پانی اس جگہ لال ہو جاتا۔

ایک دن جب ڈولفنیں اپنے روزانہ کا کھیل ختم کر چکیں تو ڈنگن نے ان سے کہا کہ بارنگوا کے پاس چلو اور ہم لوگ اس کے ساتھ 'مارو اور پکڑو' کا کھیل کھیلیں۔ گنا جانے ان کو منع کیا کہ یاکونا اس سے بہت زیادہ عقل مند ہے جتنا تم اس کو سمجھتے ہو۔ وہ تمھارے چڑانے کو اور زیادہ سہن نہیں کرے گا۔ اس سے ڈنگن اور زیادہ غصہ ہو گیا اور اس نے بارنگوا کو پریشان کرنا شروع کر دیا۔ وہ اس کو پانی کی سطح پر لے گیا جہاں دوسری ڈولفنیں بھی آ گئیں۔ ان سب نے اس کو اپنی ناکوں کے زور سے ہوا میں اوپر اچھال دیا اور جب وہ نیچے گرا تو دوبارہ اس کو اوپر اچھال دیا۔ گنا جانے نیچے جا کر یاکونا کو تسلی دینے کی کوشش کی لیکن وہ پہلے ہی مانا کو بلانے کے لیے آوازیں دینے لگے تھے۔ ''بند کرو یہ سب'' بارنگوا نے چیخ کر کہا ''یاکونا نے شارک کو بلانے کے لیے آواز دے دی ہے۔ اپنی جانیں بچاؤ۔ ورنہ تم سب کی جانیں جائیں گی۔''

ڈولفنیں اپنے کھیل میں اتنی مست تھیں کہ اس کو بند کرنے کا ان کو خیال ہی نہیں آیا۔ بارنگوا نے پہلی بار ایک لمبا کالا سا پہیہ دیکھا جو سطح سمندر سے کافی نیچے ڈولفنوں کے قریب ڈولنے لگا تھا۔ ''ہوشیار ہو جاؤ۔'' وہ چیخا ''شارک آ گئے ہیں''

لیکن ڈولفنوں نے ہنس کر ڈال دیا۔ چند ہی منٹوں میں ان کی ہنسی چیخ پکار میں بدل گئی۔ کیونکہ شارک نے ان پر حملہ کر دیا تھا اور وہ ان کو مار کاٹ کر پھینکنے لگ گئے تھے۔ ذرا ہی دیر میں سمندر کا پانی ڈولفنوں کے خون سے لال ہوگیا۔ ڈنگن کے جسم کے دو ٹکڑے ہو گئے تھے۔ پہلے اس کا سر پھر اس کی دم بہتی ہوئی یا کونا کے قریب پہنچ گئی جہاں گنا جا بھی موجود تھا۔ ڈر کے مارے اس کی چیخ نکل گئی۔ شارک نے اس کی چیخ سن کر اس پر بھی حملہ کر دیا۔ لیکن یا کونا مچھلیوں نے اپنی مضبوط سیپیوں کے بیچ میں اس کو اس طرح چھپا لیا کہ شارک اس کو دیکھ نہ سکا اور آگے نکل گیا۔

انجام یہ ہوا کہ اس قتل عام میں گنا جا کے علاوہ اس علاقے کی ساری ڈولفنیں ماری گئیں۔ وہ بیچاری بہت سہمی ہوئی اور دکھی تھی۔ تب ہی اس نے ایک بچے کو جنم دیا۔ اس نے بچے کا نام اس کے باپ کے نام پر ڈنگن جابانا رکھا۔ بچہ بڑا ہو کر اس سے پہلے کی ڈولفنوں کے مقابلے میں بہت بڑا اور بھاری بھرکم ہوگیا۔ وہ اتنا طاقتور تھا کہ اب اس کو مانا (شارک) کا بھی کوئی ڈر نہیں رہا۔

پھر یہ ہوا کہ اس قتل عام میں ماری گئی ساری ڈولفنوں کی روحیں سخت اور خشک ہو کر بڑھنے لگیں اور پھر ایک لمبے زمانے کے بعد زمین پر ان کا دوبارہ جنم ہوا۔ یہی سب سے پہلے کے انسان تھے۔

ایک رات گنا جا نے اپنے شوہر کو سمندر کے ساحل پر دیکھا۔ وہ ایک انسان کی صورت میں تھا۔ وہ کسی طرح ساحل کے پاس پڑی ریت تک پہنچ گئی اور ڈنگن نے اس کو پہچان لیا۔ گنا جا نے ایک خوشی سے زبردست چیخ ماری اور پھر اچانک وہ بھی ایک انسانی صورت میں تبدیل ہوگئی۔ ''دیکھو ادتیہ! جب ہم ڈولفنوں کو ساحل کے قریب منڈلاتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ ہم جان لیتے ہیں کہ یہ اپنے انسانی ساتھیوں کی کھوج کر رہی ہیں۔''

''پھر ڈنگن اور گنا جا کے کئی اور بچے پیدا ہوئے جو کہ گروٹ جزیرے کے پہلے باشندے تھے۔ یہ شامن جس کو تم نے کچھ دیر پہلے دیکھا ہے، انھی میں سے ایک ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو یہ جانتے ہیں کہ ڈولفنیں ہی انسانی نسل کی جنم داتا تھیں۔ خود ڈولفنیں بھی جانتی ہیں کہ انسان ان کے بھائی بند ہیں کیونکہ ان کی ماں گمنا جا تھیں۔'' یہی وجہ ہے ادتیہ! کہ ڈولفنیں انسانوں کے ساتھ کھیلنا اسی طرح پسند کرتی ہیں جیسے کہ وہ سپنوں کے زمانے میں کھیلتی تھیں۔ آسٹریلیا کے آدی باسیوں کے لیے ہر چیز جادو کا درجہ رکھتی ہے۔ ہر چیز کسی بڑی چیز کا حصہ ہے۔ وہ اپنے پرکھوں کو چٹانوں، ستاروں اور کنگاروؤں بلکہ ہر چیز میں دیکھتے ہیں اور شاید یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے آس پاس کی دنیا سے مل جل کر رہتے ہیں۔''

''بڑی انوکھی بات ہے'' ادتیہ نے کہا ''ماڈرن آدمی، آسٹریلیا کے آدی باسیوں کو پراچین قوم کہتا ہے۔ حالانکہ یہ انسان ہی ہے جو اپنے اردگرد کی دنیا کو خراب کرتا ہے اور ہر اس چیز کو برباد کر دیتا ہے، جس سے اس کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔ وہ ان آسٹریلیا آدی باسیوں سے بہت کچھ سیکھ سکتا ہے۔''

■

ماخذ: اُدتیہ۔سمندری لڑکا، مصنف: انیتا سرن
مصور: سُبیر رائے، مترجم: نامی انصاری
ناشران: (1) چلڈرن بک ٹرسٹ (2) قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی (3) بچوں کا ادبی ٹرسٹ

ابراھیم اختر

آخری قربانی

جنوبی ہند کے ایک وسیع جنگل میں ایک شیرنی رہا کرتی تھی۔ اس کا ایک بچہ بھی تھا جسے وہ بے حد چاہتی تھی۔ قدرتی اتفاق دیکھیے کہ وہ ایک دن بیمار پڑ گیا۔ اس کی بیماری بڑھتی ہی گئی اور وہ ایک دن دنیا سے چل بسا۔ شیرنی کو اس کی موت کا بے حد دکھ ہوا۔ اس نے اس کے غم میں کھانا پینا چھوڑ دیا اور دیوانوں کی طرح بے تحاشہ گھومتی رہی۔ کبھی کبھی چیختی چلاتی بھی تھی۔ آخر ایک عرصے کے بعد اسے تھوڑا سا سکون ہوا اور وہ دھیرے دھیرے ٹھیک ہوگئی۔

ایک دن اتفاق ایسا ہوا کہ ہرن کا ایک چھوٹا سا خوبصورت بچہ اچانک اس شیرنی کے سامنے آگیا۔ اس نے پہلے تو اسے غور سے دیکھا پھر اس کے قریب جا کر پیار سے اسے چاٹنے لگی۔ بہت دیر تک اسے چاٹتی رہی پھر اسے اپنی گپھا میں لے گئی اور اسے اپنے قریب لٹا کر اسے پیار سے پھر چاٹنے لگی۔ اس طرح اس کی ممتا جاگنے لگی اور وہ اسے اپنا ہی بیٹا سمجھنے لگی۔ اس طرح دن گزرتے رہے اور وہ اسے اپنے ساتھ سارے جنگل میں لے کر گھومتی رہی اور اسے گھاس کھلاتی رہی۔ ہرن کا بچہ بھی اس سے خوف کھانے کی بجائے اس سے لپٹ کر رہنے لگا۔ دونوں کی محبت پروان چڑھنے لگی اور وہ ایک دوسرے کے ہوکر رہ گئے۔

گرمی کا زمانہ تھا۔ دوپہر کے وقت شیرنی درختوں کے جھنڈ میں آرام کر رہی تھی۔ اس کے پہلو میں بچہ بھی لیٹ گیا۔ تھوڑا سا وقت گزرا بھی نہیں تھا کہ بچے کو پیاس لگی۔ وہ اٹھ کر تالاب کی طرف گیا۔ تالاب پر جا کر پانی پینے کے لیے آگے بڑھا۔ دوسری طرف ایک بھیڑیا بھی پانی پی رہا تھا۔ اس کی نظر بچے پر پڑی اور آناً فاناً اس نے بچے کو دبوچ لیا اور دیکھتے ہی دیکھتے اسے کھالیا۔ کافی دیر بعد شیرنی نیند سے جاگی تو اس کے سامنے اس کا بچہ نہیں تھا۔ وہ بے تحاشہ اِدھر اُدھر دوڑنے لگی لیکن اسے کہیں اس کے بچہ کا سراغ نہیں ملا۔ آخر کار وہ دوڑ کر تالاب کے پاس گئی تو تالاب کے کنارے اسے دو چار ہڈیاں اور زمین پر خون کے دھبے نظر آئے۔ وہ یہ منظر دیکھ کر پاگل ہوگئی۔ تھوڑی ہی دور پر اسے بھیڑیا نظر آیا جو آرام کی نیند سو رہا تھا۔ شیرنی کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ یہ اسی بھیڑیے کی حرکت ہے۔ اس کی سمجھ میں آتے ہی وہ اس پر جھپٹ پڑی اور دونوں میں لڑائی شروع ہوگئی۔ یہ خوفناک لڑائی تقریباً آدھا گھنٹہ چلی۔ آخر کار بھیڑیا شیرنی کے سامنے ڈھیر ہوگیا۔ اس خطرناک لڑائی میں شیرنی بھی بری طرح زخمی ہوگئی تھی۔ وہ اپنے جسم کے زخموں کو چاٹتی ہوئی وہاں بیٹھ گئی جہاں اس کے بچے کی ہڈیاں اور خون زمین پر پھیلا ہوا تھا۔ وہ دیوانہ وار ہڈیوں کو چاٹنے لگی۔

دو دن تک وہ وہیں بیٹھی رہی۔ کچھ کھایا نہ پیا۔ آخر کار اسی حالت میں اس کا دم آخر ہوگیا اور زمین پر لوٹتے ہوئے اس کی روح پرواز کرگئی۔ ■

Ibrahim Akhtar 'Fasana'
Building Yusuf Colony
Parbhani - 4314001 (Maharashtra)

دانائی کی باتیں

★ عدالت، ہدایت کا مقام نہیں سزا کی جگہ ہے۔ (سقراط)

★ ہر زمانے میں موسم بہار موجود رہتا ہے یعنی انسان ہر وقت اور ہر عمر میں علم و ہنر حاصل کرسکتا ہے۔ (سقراط)

★ مصیبتیں اور بیماریاں اتنی خطرناک نہیں ہوتیں جتنی کہ بزدلی اور کم ہمتی کی وجہ سے نظر آتی ہیں۔ (سقراط)

★ برے کاموں پر اظہار ندامت نہ کرنا ایک اور برائی ہے۔ (سقراط)

★ جو شخص خود اپنے اوپر حکومت کرنا نہیں جانتا۔ یاد رہے کہ وہ ہمیشہ دوسروں کا غلام رہے گا۔ (سقراط)

★ اگر تم امیر بننا چاہتے ہو تو اپنی فرصت ضائع نہ کرو۔ (بقراط)

★ مفلس کو تھوڑی اشیا کی ضرورت ہے۔ آسودہ حال کو بہت کی اور لالچی کو تمام اشیا کی۔ (بقراط)

★ زندگی کا ایک مقصد بنا لیجیے پھر ساری قوت اس کے حصول پر صرف کردیں۔ آپ یقیناً کامیاب ہوں گے۔ (بقراط)

★ زیادہ گرم کھانا، سورج کی طرف دیکھنا، سر پر گرم پانی ڈالنا اور نشہ آور اشیا کا استعمال کرنا آنکھوں کے لیے نقصان دہ ہے۔ (بقراط)

★ شک جس دروازے سے اندر تک آتا ہے۔ محبت و اعتماد اسی دروازے سے باہر نکل جاتے ہیں۔ (بقراط)

★ دولت سے نرم بستر حاصل کیا جاسکتا ہے مگر نیند نہیں۔ دولت سے ہم نشیں حاصل کیے جاسکتے ہیں لیکن دوست نہیں۔ (بقراط)

★ ”آلائش اور نفاق سے پاک دل سے بڑھ کر انسان کا کوئی محافظ نہیں۔ (شیکسپیئر)

★ جس آدمی کا موقف درست ہے وہ مصلح ہے لیکن جس کا ضمیر بے انصافی سے زنگ آلود ہو چکا ہو وہ خواہ فولاد کی چادر سے لپٹا رہے بالکل عریاں ہے۔ نصیحت، سچی خیر خواہی، جسے ہم نہیں سنتے۔ یہ شاید بدترین دھوکا ہے، جس پر پوری توجہ دیتے ہیں۔ (شیکسپیئر)

★ انسان کی خوبیاں تو اس کے تابوت کے ساتھ دفن ہو جایا کرتی ہیں مگر اس کی برائیاں یاد رکھی جاتی ہیں۔ (شیکسپیئر)

★ جن کے دل لوگوں کے خوف سے آزاد ہوتے ہیں، شہرت اور نیک نامی انہی کے حصے میں آتی ہے۔ (شیکسپیئر)

★ نافرمان بیٹے کا وجود، سانپ کے زہر سے زیادہ مہلک ہوتا ہے۔ (شیکسپیئر)

★ دیو کی طرح طاقتور ہونا اچھی بات ہے مگر دیو کی طرح طاقت استعمال کرنا ظلم ہے۔ (شیکسپیئر)

★ انسانوں کے حالات میں ایک وقت ایسا آتا ہے جب وہ ایک لہر کے بل پر کہیں سے کہیں پہنچ سکتے ہیں لیکن اگر اس موقعے کو ضائع کردیا جائے تو پھر اس کے دوبارہ حاصل ہونے کا امکان نہیں ہوتا۔ (شیکسپیئر)

(ادارہ)

ارم لیاقت پٹھان

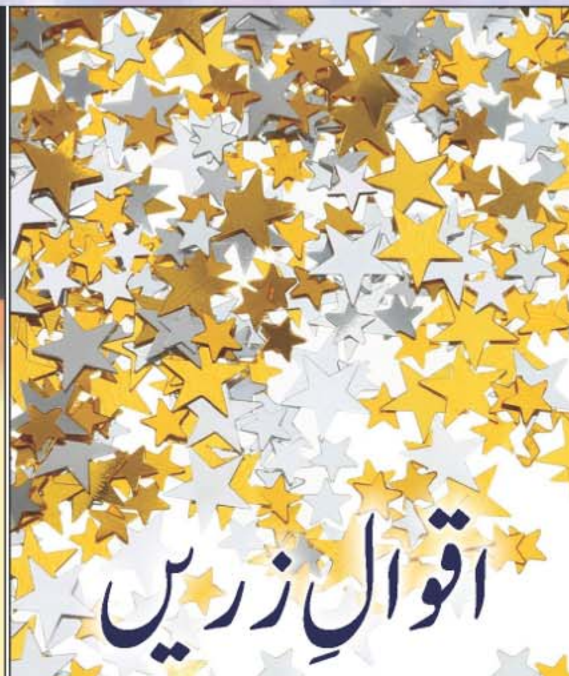

اقوالِ زریں

1. جو شخص تجھے برائی سے روکے وہی تیرا دوست ہے۔
2. ایک عالم ہزار جاہلوں سے بہتر ہے۔
3. جس کی زبان شیریں ہے اس کے دوست بہت ہیں۔
4. علم اللہ تعالیٰ کی طرف سے روشنی ہے۔
5. دوسروں کو اچھے نام سے پکارو۔
6. خوبیاں قربانیوں سے پیدا ہوتی ہیں۔
7. عقل علم سے وابستہ ہے۔
8. خطا کار ہمیشہ پریشان رہتا ہے۔
9. لباس کی سادگی ایمان کی علامتوں میں سے ایک ہے۔

■

Iram Liyaquat Pathan,Class:VI
YEWS National High School for Girls, Maulana Azad Road, Sarda Circle, Nasik (Maharashtra)

سید ارشاد عالم

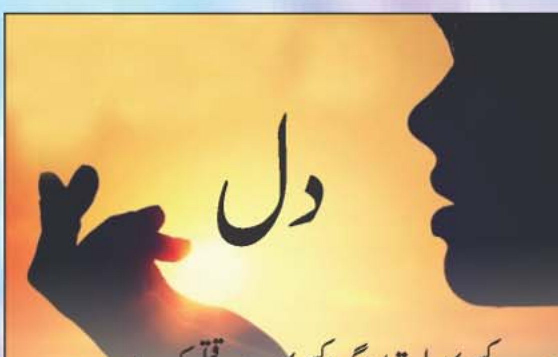

دل

1. کسی کا دل توڑنا گویا کسی کا بے وجہ قتل کر دینا ہے۔
2. دل اس بستی کی طرح ہے جو ایک بار اجڑ جائے تو پھر مشکل سے بستی ہے۔
3. اپنی عارضی خوشی کے لیے کسی کا دل مت دکھاؤ، کیونکہ تم بھی سینے میں دل رکھتے ہو۔
4. دل ایک شیشے کی مانند ہے۔ جب ٹوٹ جاتا ہے تو پھر نہیں جڑتا۔
5. دل سمندر کی طرح ہے۔ بظاہر خاموش مگر اس کی گہرائیوں میں طوفان بپا رہتا ہے۔
6. دل کی طرح ملائم اور اس کی طرح سخت دنیا میں کوئی شے نہیں۔
7. نرم دل، خالقِ کائنات کی سب سے خوبصورت تخلیق ہے۔
8. کتنے اچھے ہیں وہ لوگ جو کسی کے دل کا سکون اور آنکھوں کا نور ہیں۔
9. دل کا سکون چاہتے ہو تو حسد سے دور رہو۔
10. کسی کے ساتھ دلی رشتہ قائم کرنا چاہتے ہو تو اپنے دل میں شک کی گنجائش نہ رکھو۔

■

Syed Irshad Alam
Daryapur-P.O: Kood, Sungra
Distt: Cuttack (Odisha)

آپ کا دماغ کتنا تیز ہے؟

دوستو! یہ دونوں تصویریں دیکھنے میں تو ایک جیسی لگتی ہیں لیکن تصویروں کی نقل بنانے والے سے ایک دو نہیں بلکہ دس غلطیاں ہوگئی ہیں۔ کیا آپ ان غلطیوں کو تلاش کر سکتے ہیں؟ 10 منٹ میں اگر آپ نے تمام غلطیاں تلاش کر لیں تو سمجھ لیں کہ واقعی آپ کا دماغ بہت تیز ہے۔

جنیرہ جیلانی مکاندار

چار سال کا بوڑھا

ایک دن ایران کا مشہور بادشاہ نوشیرواں کہیں جارہا تھا کہ راستے میں ایک بوڑھا ملا جسے دیکھ کر بادشاہ نے پوچھا بڑے میاں! تمھاری عمر کتنی ہوگی؟ بوڑھے نے جواب دیا جہاں پناہ کی عمر اور دولت زیادہ اس گنہگار کی عمر صرف چار سال کی ہے۔

نوشیرواں نے کہا۔ ہیں! یہ بڑھاپا اور اتنا بڑا جھوٹ؟ تمھاری عمر اَسّی سے کم نہیں ہوسکتی۔

بوڑھے نے جواب دیا۔ جہاں پناہ! حضور والا کا اندازہ بہت درست اور بالکل صحیح مگر اسی میں چھہتر (76) سال اس عاجز نے یونہی گنوا دیے۔ جن میں صرف اپنا اور بال بچوں کا پیٹ پالنا ہی کام سمجھتا رہا۔ اس کے سوا کوئی نیکی کمائی نہ کسی غریب کی مدد کی۔ اب چار سال سے یہ عقل آئی ہے کہ ہم لوگ فقط اپنے ہی لیے پیدا نہیں ہوئے بلکہ دوسروں کا بھی ہم پر کوئی حق ہے اور اب اس پر عمل کررہا ہوں۔ اس لیے اصلی عمر صرف چار ہی سال سمجھتا ہوں باقی فضول۔

بوڑھے نے کیسی اچھی بات کہی کہ جب تک آدمی اپنے کام کو نہ سمجھ لے، آدمیوں میں گنا نہیں جاسکتا۔ بزرگی عقل پر ہے، عمر پر نہیں اور سخاوت دل پر موقوف ہے، مالداری پر نہیں۔ جو لوگ ان باتوں کو پہلے سے سمجھ لیں ان کی کسی بات سے دوسروں کو تکلیف نہیں پہنچتی، بلکہ وہ ہمیشہ کمزوروں اور غریبوں کی مدد کرکے بھلائیاں حاصل کرتے ہیں۔

■

Junairah Jeelani Makandar
Class : VII ,G.Yuva H.P.School
Karnataka

1

سیدہ جنیرہ تعظیم قادری سید رضوان الدین قادری، درجہ نہم
فاطمہ گرلس اردو ہائی اسکول، اورنگ آباد، مہاراشٹر

اریبہ مہک اعجاز احمد خان، درجہ چہارم
ضلع پریشد اردو مڈل اسکول، ضلع امراؤتی، مہاراشٹر

اریب احمد، درجہ: کے جی بی
دی اسکالر اسکول، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی

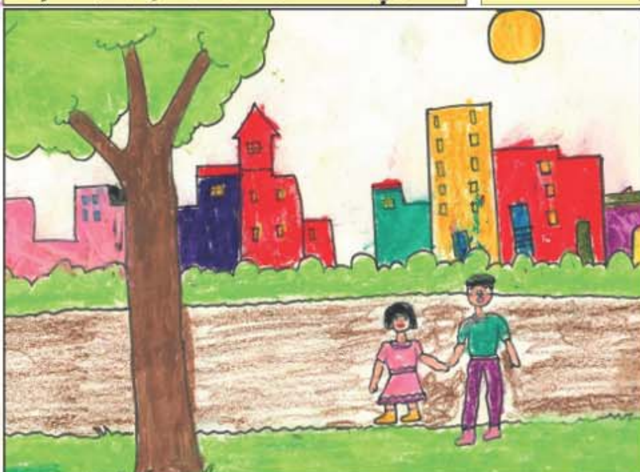

کاشفہ، درجہ ہفتم، زید پبلک اسکول، نئی دہلی

سید معاذ عفان، درجہ: ہشتم
سیفی اردو انگلش اسکول، امراؤتی، مہاراشٹر

محمد اسد، درجہ: سوم، ڈی اے وی، پبلک اسکول، نانگلوئی، نئی دہلی

ننھے فنکار

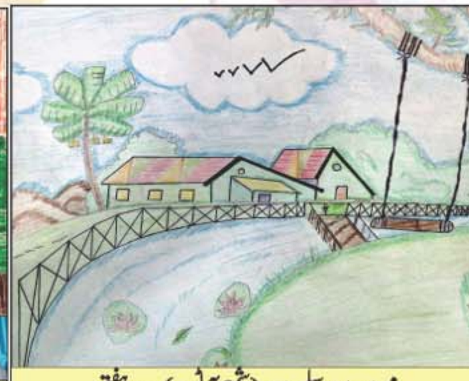

محمد ارسلان سلیم احمد (شمع آرٹس)، درجہ ہفتم
پری پریمیئر اردو اسکول، مالیگاؤں، مہاراشٹر

محمد معاویہ، درجہ دوم بی، ایم ایس کریٹیو، اولڈ دہلی

ماہین محمد اختر، درجہ ہشتم، ضلع پریشد، ہائی اسکول، کرکھیلی، تعلقہ جعفرآباد، ضلع ناندیڑ، مہاراشٹر

شائستہ فردوس بنت محی الدین، درجہ ہشتم
ضلع پریشد، ہائی اسکول، کرکھیلی، تعلقہ جعفرآباد، ضلع ناندیڑ، مہاراشٹر

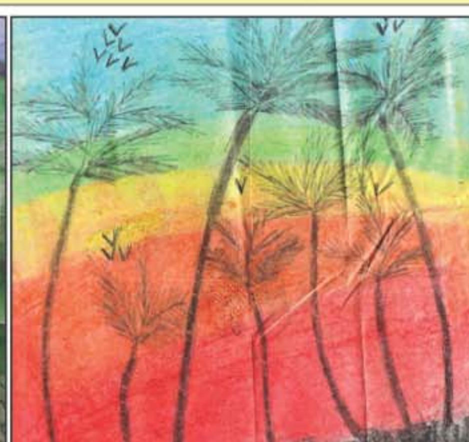

مبشرین نور احمد مجاور، انجمن ہائی اسکول، دھارواڑ (کرناٹک)

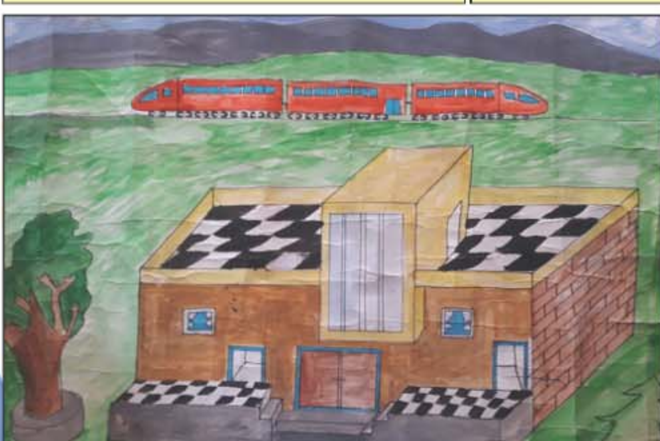

عبدالرحیم عبدالعظیم، الھدیٰ اردو ہائی اسکول، بھوکردن، تعلقہ بھوکردن، جالنہ، مہاراشٹر

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

لفظ (کچھ نظمیں اور غزلیں)

مصنف: آل احمد سرور

دوسری طباعت: 2019

صفحات: 95

قیمت: 70 روپے

کہانی رانی کیتکی اور کنور اودے بھان کی

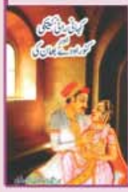

مصنف: میر انشاء اللہ خاں انشا دہلوی

پہلی اشاعت: 2019

صفحات: 30

قیمت: 35 روپے

مثنوی مولانا روم (جلد اوّل، دوم، سوم، چہارم، پنجم، ششم)

مترجم: سید احمد ایثار

پہلی اشاعت: 2019

صفحات: 223 (جلد اوّل)، 191 (دوم)، 251 (سوم)، 200 (چہارم) 238 (پنجم)، 256 (ششم)

قیمت: 780 روپے (فی سیٹ)

صحت الفاظ

مصنف: سید بدرالحسن

ساتویں طباعت: 2019

صفحات: 253

قیمت: 90 روپے

مولانا ابوالکلام آزاد: ایک مطالعہ

مرتب: پروفیسر عبدالستار دلوی

دوسری طباعت: 2019

صفحات: 474

قیمت: 215 روپے

قطبی علاقے کیا ہیں؟

مصنف: ہایانون

اردو مترجم: انیس الحسن صدیقی

پہلی اشاعت: 2019

صفحات: 20

قیمت: 20 روپے

کہکشاں (اقبال کے بعد نظمیہ شاعری)

مصنف: وارث علوی

پہلی اشاعت: 2019

صفحات: 527

قیمت: 240 روپے

عام لسانیات

مصنف: پروفیسر گیان چند جین

تیسری طباعت: 2019

صفحات: 910

قیمت: 395 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

BACHON KI DUNIYA Monthly, March 2020 Vol. 08, Issue: 03
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Higher Education, Ministry of Human Resource Development, Government of India

RNI NO. DELURD/2013/50375
DL(S) - 01/3439/2019-21
ISSN 2350-1286
Date of Publication : 03/10/20
Date of Dispatch: 12 and 13 of advance Month

سوچھ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

بچوں کے لیے قومی اردو کونسل کی چند دلچسپ کتابیں

صفحات:112، قیمت:25 روپے

صفحات:105، قیمت:35 روپے

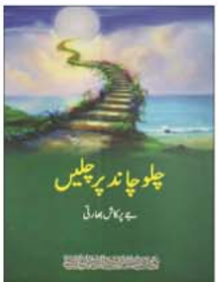

صفحات:48، قیمت:16 روپے

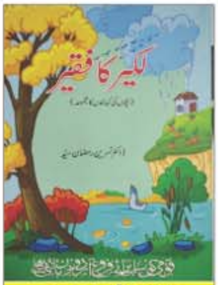

صفحات:82، قیمت:35 روپے

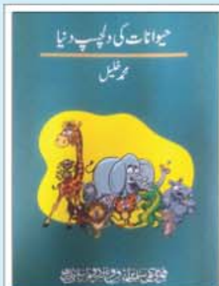

صفحات:83، قیمت:24 روپے

صفحات:61، قیمت:20 روپے

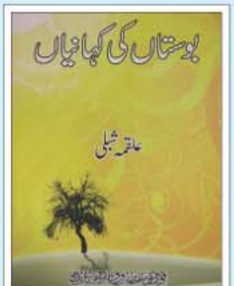

صفحات:87، قیمت:20 روپے

صفحات:61، قیمت:20 روپے

خریداری کے لیے رابطہ کریں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون:011-26109746، فیکس:011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

Printed and Published by Dr. Aquil Ahmad, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at S. Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II, New Delhi - 110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan, FC-33/9, Institutional Area, Jasola, New Delhi -110025.